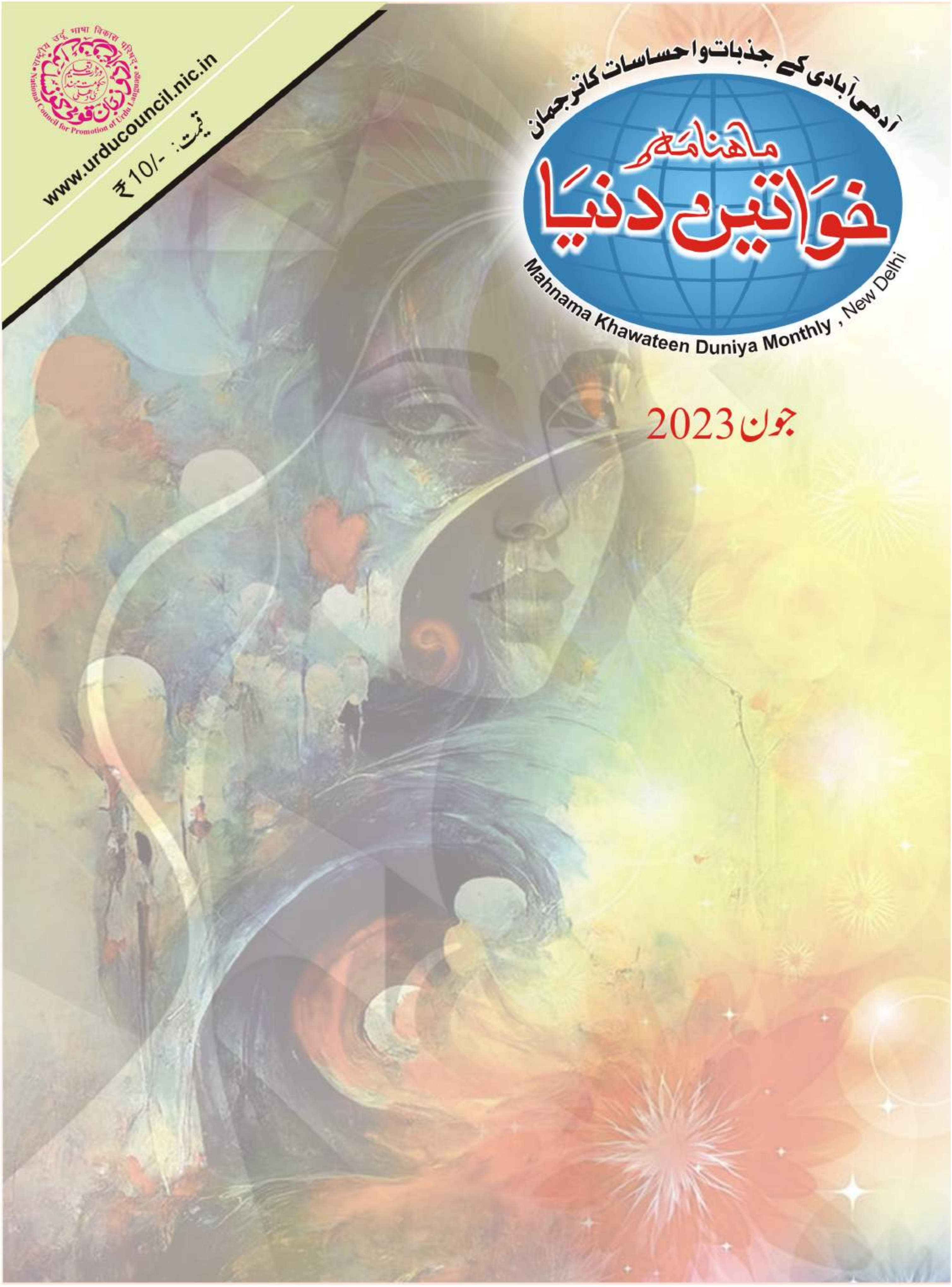

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جون 2023

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

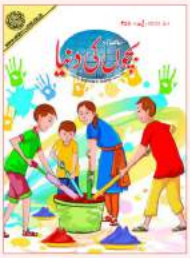

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

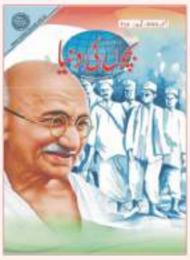

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد: 7 شمارہ: 6 جون 2023

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم بحکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی - 110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages **64**

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل — مدیر — 4

شخصیت

کانتا گرو ور شبنم کے کلام میں تقسیم ہند اور جذبۂ حب الوطنی — خواجہ عبد المنتقم — 5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 9

جہان نسواں

معاشرے کی ترقی میں ریاضی کا کردار — ڈاکٹر روحی فاطمہ — 10
افسانوی ادب میں نثار راہی کا مقام — ڈاکٹر فرخندہ ضمیر — 17
اکبر زاہد کے افسانوں میں انشاء پردازی — فوزیہ حبیب — 22
مسرور جہاں کا افسانہ 'کہاں ہو تم' پر ایک نظر — افزا خاتون — 27
آنگن آنگن پروائی: رفیعہ شبنم عابدی — انزلا فاروقی — 29
محمد انصار اللہ کی ذوق شناسی — ثنا غزل — 32
ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کے سماجی مسائل — میسرہ اختر — 38

حسن سخن

ڈاکٹر قدسیہ انجم علیگ، ذاکرہ شبنم — 43

افسانہ

دو آنکھیں — شکیلہ نگار — 45
خود مختاری — محمودہ قریشی — 50
آنگن کی تتلیاں — رومانہ عفت راہی — 55

صحت

خواتین اور نفسیاتی مسائل — ڈاکٹر بشریٰ اشرف — 59

قارئین کے خطوط

مراسلہ — 62

مشعل

صحت انسانی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اچھی صحت کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔ صحت مند خواتین معاشرے میں نئے نئے کاموں کو بہ حسن وخوبی ادا کرسکتی ہیں۔ صحت کے متعلق خواتین کا رویہ عموی طور پر نظرانداز کرنے والا ہوتا ہے لیکن کورونا وبا کے دوران خواتین نے بہت فعال کردار ادا کیا۔ عالمی وبا نے خواتین کو عالمی پیمانے پر اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ خواتین نے ایسے ماحول میں مثبت سوچ کو فروغ دیا اور صحت کے تئیں عمومی نظریہ کو پوری طرح تبدیل کردیا۔

صحت مند معاشرہ میں صحت مند نسل پروان چڑھتی ہے۔ صحت مند معاشرے کی تشکیل میں خواتین کا اہم کردار ہوتا ہے۔ خانگی زندگی کا بیشتر دارومدار عورت پر ہوتا ہے۔ عورت کو خانگی اور معاشرتی دونوں سطح پر بہت فعال کردار ادا کرنے کے لیے تعلیم سے بہرہ مند ہونا ضروری ہے۔ تعلیم کی کمی کے باعث وہ زمانے کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کرسکتیں اس لیے انھیں تعلیم یافتہ ہونے کی اشد ضرورت ہے۔

صحت مند معاشرے اور خاندان کے لیے خواتین کو زندگی کے ہر شعبے میں فیصلہ سازی کا حق دیا جائے تو اس کے بہتر نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ خواتین کو خانگی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ دوسری ذمہ داریاں بھی نبھانی ہوتی ہیں۔ دونوں میں توازن رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ خواتین میں بہت کچھ سیکھنے اور کرگزرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ اس کا عمدہ نمونہ عالمی وبا کرونا کے دوران دیکھنے کو ملا۔

عورت نفسیاتی طور پر فطرت سے جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ صالح معاشرے کی قدرداں ہوتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ اپنے اردگرد کے ماحول کو بھی صاف شفاف رکھے اور ماحولیات کے تئیں بیداری کا ثبوت فراہم کرے۔ فی زمانہ خواتین ماحولیات کے تئیں کافی حد تک بیدار ہوئی ہیں۔ ہم اپنا طرز زندگی تبدیل کرکے معاشرے کو اور بہتر بناسکتے ہیں اور صحت اور ماحولیات کے تئیں اپنا مثبت کردار ادا کرسکتے ہیں۔

خواتین کی فلاح کے لیے ضروری ہے کہ خواتین صحت کے تئیں بیدار ہوں اور ان کے پاس بہتر امکانات ہوں۔ گھر، خاندان اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے ہم سب کو فکرمند ہونے کی ضرورت ہے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شخصیت

خواجہ عبدالمنتقم

کانتا گرور شبنم کے کلام میں
تقسیم ہند اور جذبہ حب الوطنی

رائے بہادر بھگت جگن ناتھ کی صاحبزادی، سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس اے۔ این گروور کی اہلیہ اور ہماری شاگردہ کانتا گروورر شبنم 6 جون، 1921 کو غیر منقسم ہندوستان اور غیر منقسم پنجاب کے تاریخی و ادبی شہر لاہور میں پیدا ہوئیں اور 26 فروری، 1992 کو نئی دہلی میں وفات پائی۔ شبنم نے کتنے ہی نجی و عام مشاعروں میں اپنا کلام سنایا اور انھیں ایک مرتبہ یوم جمہوریہ کے موقع پر لال قلعہ کے مشاعرہ میں بھی اپنا کلام سنانے کا موقع ملا۔ ان کا مجموعہ کلام دو کتابوں 'شبنم کے موتی' اور 'نغمہ نوبہار' کی شکل میں ان کی زندگی میں ہی شائع ہوگیا تھا۔ ان کا اردو کلام 'شبنم کے موتی' دیوناگری رسم الخط میں 1971 میں شائع ہوا جو کافی مقبول ہوا۔ تقریب رونمائی میں ہندوستان کی مشہور اداکارہ وجینتی مالا نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی تھی یا 'نغمہ نوبہار' کی رونمائی کی تھی، ہمیں پوری طرح یاد نہیں جبکہ ہم اس تقریب میں خود بھی شریک تھے۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام 'نغمہ نوبہار' 1983، میں اردو میں شائع ہوا۔

'نغمہ نوبہار' میں سابق چیف جسٹس آف انڈیا و نائب جمہوریہ ہند عزت مآب جناب ہدایت اللہ نے اپنے پیش لفظ میں کانتا گروور شبنم اور ان کے کلام کے بارے میں اپنی رائے اس انداز میں پیش کی ہے کہ جس پر محض ایک نظر ڈالنے سے ہی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بہت سی مسلم شاعرات کے ساتھ ساتھ ہندو شاعرات بھی گمنامی کا شکار رہی ہیں۔ البتہ ان میں سے کچھ ایسی ہیں جنھیں کچھ عرصے تک تو یاد رکھا گیا لیکن بعد میں بھلا دیا گیا۔ یہاں تک کہ ان کا کبھی ضمناً بھی ذکر نہیں ہوتا۔ ان میں ایک نام کانتا گرور شبنم کا بھی ہے۔ مذکورہ پیش لفظ کی عبارت درج ذیل ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہ صرف خود وضاحتی ہے بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

''اردو شاعری ایک بیکراں سمندر ہے۔ اس میں سے موتیوں کی جلا لیے ہوئے بہترین شعرا نکلے ہیں۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں شاعرات بھی تھیں مگر وہ تغافل کی نظر ہوگئیں۔ مورخین نے شاذ و نادر ان کا تذکرہ کیا ہے۔ قادری بیگم تلمیذۂ شاہ نصیر بیگم بنت میر تقی میر، جینا بیگم تلمیذۂ سودا بسم اللہ بیگم شاعرہ گرامی بہو بیگم جانی وغیرہ کو صرف نام سے جانتے ہیں۔ ایک مشاعرے کی افتتاحی تقریر کرتے ہوئے میں نے چند مسلم اور غیر مسلم شاعرات کا تذکرہ چھیڑا تھا اور بلا کیر سپرنٹنڈنٹ پولیس کلکتہ کی صاحبزادی جو ملکہ تخلص کرتی تھیں اور نساخ مؤلف تذکرۂ سخن الشعراء کی شاگرد تھیں ان کا ذکر کیا تھا اور ان کے چند اشعار بھی سنائے تھے۔

دیگر غیر مسلم شاعرات کے نام وغیرہ بھی بتائے تھے۔ شاعرات میں اول درجہ خاتون زیب النساء مخفی کا ہے۔ زیب النساء کی برابری تو صرف صف اول کے شعرا ہی کر سکتے ہیں۔ ان کے بعد نواب اختر محل اختر خاندان تیموری سے تھیں۔ ان کا دیوان 1288ھ میں شائع ہوا۔ چند شاعرات کو کسی شاعر کی محبوبہ بننے کا فخر حاصل تھا۔ مومن کی محبوبہ صاحب جی، نواب حاجی محمد مصطفے خاں شیفتہ کی محبوبہ بی امجو تخلص نزاکت سے مشہور ہیں۔ ان کے اشعار بھی ملتے ہیں........ اپنے زمانے میں تنویر جہاں آرا بدایونی نواب شاہجہاں بیگم والی بھوپال تخلص شیریں کے نام سے مشہور ہیں مگر یہ سلسلہ اب ٹوٹ رہا ہے۔ ہمارے لیے یہ خوشی کا باعث ہے کہ مسز گررو ور شبنم نے پھر شاعرات اور غیر مسلم شاعرات کا نام بڑھایا ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی کا عالم ہے۔ یہ شاید انگریزی تعلیم کی بدولت ہے، جس کا ذکر چکبست نے کیا تھا، قائم ہوا ہے مگر شاعرات کے سلسلے کو قائم رکھتے ہوئے نوابین اودھ کے دور کی شاعرات کی جملہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ سادگی کوئی عیب نہیں ہے۔ سادگی تحریر اور تقریر میں ہو یا شعر اور ادب میں ہو وہ بجائے خود ایک حسن ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے خود کہا تھا:

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

کوئی انسان جس میں انسانیت کا ذرا بھی جذبہ باقی ہے اور وہ مخبوط الحواس نہیں ہے اس میں یقینی طور پر وطن کی محبت کسی نہ کسی گوشے میں ضرور ہوگی۔ تقسیم ہند کے بعد شبنم کے خاندان کو ایک ایسے وقت میں جب انسان حیوان ہو چکا تھا اور سرحد کے دونوں پار کچھ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے اپنا پیارا شہر لاہور چھوڑ کر ہندوستان آنا پڑا۔ مگر انھوں نے اس دورِ ظلم کی داستانوں کو اس طرح پیش کیا کہ جس سے عوام کے مابین منافرت نہ پیدا ہو بلکہ اظہار ندامت ہو اور وہ اس بات کا احساس کریں کہ جو کچھ انھوں نے کیا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جن لوگوں نے اس طرح کے مظالم ڈھائے اور ان میں سے کچھ لوگ اگر زندہ ہوں اور ان سے یہ کہا جائے کہ اب پھر تم ایسا ہی کرو تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ دوسری جانب سے سفید پرچم ہی لہرایا جائے گا۔ شبنم کے کلام میں مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہے جیسے قومی یکجہتی، شیدائے حرم وفدائے صنم کی قربت والفت کی خواہش دلخواہ تو کبھی خلش خارِ تعصب وفرقہ پرستی، عشق ومحبت، فغانِ درد دل، دل شکنی و بے وفائی، نظام زندگی، محاذ زندگی کے محارب، ستم دنیا، رہبران قوم وعوام کی داستان ایثار وقربانی، خدمت خلق، بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت وغیرہ۔

آیئے اب ہم اپنے اصل موضوع ' کانتا گررو ور شبنم کے کلام میں تقسیم ہند کا درد، جذبۂ حب الوطنی اور اردو سے محبت' کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

شبنم کی مندرجہ ذیل غزلیں انسان دوستی، حب الوطنی، ہندو مسلم اتحاد، فرقہ پرستی، قومی یکجہتی، زبان سے محبت، بچوں کی ملک سے محبت کے حوالے سے صحیح تربیت، عیدالفطر کا بیان وغیرہ ان کی مثبت سوچ، روشن خیالی ودیانتداری کا معتبر دستاویزی ثبوت ہیں۔

دراصل ہمارا ملک ایک گلدستے کی مانند ہے اور اس گلدستے کے پھول عوام کے ہر طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ گل عام طور پر گلاب کے پھول کو کہا جاتا ہے اس میں بہت سے رنگ ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پھولوں کے رنگ جدا ہونے کے باوجود بھی ان کی رنگت اور ان کی حیثیت اس طرح برقرار رہتی ہے جس طرح مختلف رنگوں یا صورتوں کے لوگوں کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان سب کا اس طرح خوش رہنا ضروری ہے جس طرح موسم بہار میں ہر پھول میں بہار کا ثبوت ملتا ہے۔ شبنم نے گلاب کو مثال بنا کر اپنی درج ذیل نظم میں اسی جذبے کا اظہار کیا ہے۔ اس غزل میں شبنم نے جہاں کیفیت بہار کی دلفریب منظر کشی کی ہے تو وہیں گلاب کے پھول کو

علامت خلوص باطن اور دوستی کی نشانی بتایا ہے۔انھوں نے گلاب کے پھول کی خصوصیات بیان کر کے جس طرح ہندوستان کو گلاب کا پھول کہا ہے اس سے دنیا کو صاف یہ پیغام پہنچتا ہے کہ یہ انسانیت کے احترام اور اس سے محبت کا اظہار ہے۔اس سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گلاب کی اس طرح پیشکش ہندوستانی تہذیب وتمدن کی واضح عکاسی ہے۔ہم خود اس بات سے بخوبی واقف ہیں اور ہم نے بچشم خود یہ دیکھا اور محسوس کیا ہے کہ شبنم نے خود کو عشق اردو میں غرق کر لیا تھا اور تاحیات شبنم اور اردو ایک روح و دو قالب بن کر رہے۔

'نغمۂ نو بہار' کی منتخب غزلوں کے منتخب پیغام رساں اشعار

☆ہندوستان کی ہر زباں شگفتہ کلی اور اردو زباں گلاب کا پھول

پیار کا اک جہاں ،گلاب کا پھول
عشق کی داستاں ،گلاب کا پھول
اک علامت خلوص باطن کی
دوستی کا نشاں، گلاب کا پھول
ہر زباں ہند کی شگفتہ کلی
ان میں اردو زباں گلاب کا پھول

شبنم نے 'خاکِ پاکِ ہند' عنوان کے تحت اپنی نظم میں اپنے وطن ہندوستان اور حب الوطنی کی بڑی سادہ اور دلفریب انداز میں منظر کشی کی ہے

☆خاک پاک ہند

دشت و جبل ہیں سبز تو سر سبز مرغزار
صحن چمن میں رقص کرو آگئی بہار
محنت کشوں نے پھول کھلائے چمن چمن
گلشن میں اپنے ہوگیا گلچیں ذلیل و خوار
حب وطن نے کردیے بیدار اہل ہند
جاں باز اپنے دیس پہ ہونے لگے نثار
اغیار کو بھی درس یہاں پیار کا ملا
یہ سرزمین ہند، محبت کا ہے دیار
مل کر دلوں میں پریم کی گنگا بہایئے
نعرہ یہی ہمارا،یہی دیش کی پکار
اہل وطن کے دل میں ہو یہ آرزو و یہ عزم
قائم رہے وطن کا ہمالہ صفت وقار
اہل مسیح، ہندو مسلماں، سکھ سبھی
ہندوستاں کی آنکھ کے تارے ہیں جاں نثار
مہیلائیں اپنے دیش کی پرچم بلند کریں
مریم، یشودا، فاطمہ، سیتا، ستی، نگار
ہندوستاں کے دولت و اقبال کا عروج
پائندہ تر ہو عزم جواں ہو شریک کار
ہندوستاں کی خاک مسیحا سے کم نہیں
رنگ رخ حیات پہ آجائے ہے نکھار
اس خاک پاک ہند کو مرا سلام
کاشی یہی ہے، کعبہ یہی ہے، اس پے جاں نثار

☆آئی بہار ہند

آئی بہار ہند کے گلشن میں جھوم کر
حب وطن کے پھول کھلے ہیں ادھر ادھر
ہندی نثار ہو گئے دھرتی کو چوم کر
سینچا چمن کو خون سے ہم نے تو گل کھلے
کیسے بہار آئی گلچیں کو کیا خبر؟

موسیقی کی محفلیں سجانا اور ان میں اصحاب ذوق کو مدعو کرنا شبنم کا خاص شوق و معمول تھا۔ تمام تیوہار سب کے ساتھ مل کر مناتی تھیں۔ان کی عیدالفطر پر لکھی نظم اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ تمام مذاہب کے تیوہاروں کا خیال رکھتی تھیں۔وہ عید سے وابستہ خوشی و جمال عید پھیکا پڑنے کی وجوہات سے بھی بخوبی واقف تھیں۔

☆عید

آیا جو عید سے پہلے خیال عید
رویا گلے میں ڈال کے بانہیں مآل عید
پھیکا سا پڑ گیا ہے جبھی تو جمال عید
ایسا کہاں نصیب کہ دیدار ہو نصیب
ان سے جدا ہے دیکھ رہے ہیں ہلال عید
رنگین پھول، شوخ کلی، مست شاخ سبز

☆نظم بعنوان 'یہ بچے! میں 'بچوں میں جذبۂ حب الوطنی پیدا کرنے کی والدین کو تلقین

بچوں کو حسیں ماحول ملے
یہ فرض ہر اک ماں باپ کا ہے
تعلیم کی دولت دو ان کو
انسان بنا دو بچوں کو
مذہب ہوں لاکھ الگ لیکن

ہے ایک ہی منزل انساں کی
گیتا، قرآن، انجیل، گرنتھ
آگاہ کرادو بچوں کو!
رہنا سیکھیں پیار سے مل کر
یہ پاٹھ پڑھادو بچوں کو

☆ **کمزور وستم زدہ افراد کی تکلیف کا احساس، جذبۂ خدمت خلق اور دعوت فکر وعمل**

ان کی مختلف غزلوں کے درج ذیل اشعار سے بھی یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ وہ ایک دردمند دل رکھتی ہیں:

کیوں اندھیرا ہوا اپنی بستی میں
رات بھر دل کے چراغ جلتے ہیں
کیا سبب کہ ہم بہاروں میں
انتظار بہار کرتے ہیں!

عجب رنگ بہاراں ہے، عجب نظم گلستاں ہے
چمن کے پھول، فصل گل میں بھی مرجھائے جاتے ہیں
اپنے غم کو بھول گئے
اوروں کا غم کھانا تھا
پروردگار تجھ سے شکایت بھی کیا کریں
مجبور ودل فگار بغاوت بھی کیا کریں
بجلیوں کی زد میں کیوں رکھ دیں بنائے آشیاں
چند تنکے لائے ہیں منقار میں مشکل سے ہم

Khwaja Abdul Muntaqim
H-3,Dharma Apartment,
2-IP Extn.
Delhi-110092
Mob.9818369624

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

شاعرات کے منتخب اشعار

کانٹے ہوں یا پھول اکیلے چننا ہوگا
ہم جیسا محتاط ہمیشہ تنہا ہوگا

فکر و تردد میں ہر دم کیا گھلتے رہنا
ہوگا تو بس وہ ہی جو کچھ ہونا ہوگا

بلقیس ظفیر الحسن

برے دنوں میں مجھے یوں سنبھال سکتا تھا
وہ اپنے خواب مرے دل میں پال سکتا تھا

اسے بچانا تھا تیراک بھی نہیں تھی میں
مجھے یہ فیصلہ مشکل میں ڈال سکتا تھا

رتو کوشک

تہ گرداب تو بچنا مرا دشوار ہے پھر بھی
کنارے دور ہیں ٹوٹی ہوئی پتوار ہے پھر بھی

تھکن سے چور ہوں، سر رکھ دیا ہے اس کے سینے پر
مجھے معلوم ہے یہ ریت کی دیوار ہے پھر بھی

پروین شیر

خود فریبی ہے دغا بازی ہے عیاری ہے
آج کے دور میں جینا بھی اداکاری ہے

کاش بجلی کوئی چمکے کوئی بادل برسے
آج کی شام زمینوں پہ بہت بھاری ہے

رفیعہ شبنم عابدی

سرد رشتوں کی برف پگھلی ہے
دھوپ مدت کے بعد نکلی ہے

پھوٹ پانی میں پڑ گئی ہے کیا
لہر دریا بنانے نکلی ہے

پوجا بھاٹیا

مرے چارہ گر تجھے کیا خبر، جو عذاب ہجر و وصال ہے
یہ دریدہ تن یہ دریدہ من تری چاہتوں کا کمال ہے

مجھے سانس سانس گراں لگے، یہ وجود وہم وگماں لگے
میں تلاش خود کو کروں کہاں مری ذات خواب وخیال ہے

تسنیم عابدی

اشک آنکھوں کے لیے ہے اور غم دل کے لیے
اک سمندر کے لیے ہے ایک ساحل کے لیے

ہم سفر عزم سفر ہو تو سفر آسان ہے
راستے خود راستہ دیتے ہیں منزل کے لیے

راحت سلطانہ

خزاں نے ستایا نہ خاروں نے لوٹا
گلوں نے دیے دکھ بہاروں نے لوٹا

تلاطم میں پہلے ہی جو لٹ چکے تھے
اے رومی انھیں پھر کناروں نے لوٹا

رومانہ رومی

(بحوالہ ریختہ ویب سائٹ)

معاشرے کی ترقی میں ریاضی کا کردار

ڈاکٹر روحی فاطمہ

جہانِ نسواں

تعارف:

ہر تہذیب کے ارتقاء میں ریاضی کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ کسی بھی قوم کی سماجی، معاشی اور تکنیکی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے میں ریاضی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ اہمیت اسے موجودہ دور میں ہی حاصل نہیں ہوئی ہے بلکہ قدیم زمانے سے ہی اس نے یہ مقام حاصل کر لیا تھا اور آج کی دنیا میں تو جہاں سائنس اور ٹکنالوجی کے رجحانات زیادہ سے زیادہ غالب ہوتے جا رہے ہیں وہاں ریاضیاتی علوم کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ بچوں کو ابتدا سے ہی ریاضی کی مضبوط بنیاد کے ساتھ تیار کیا جائے تا کہ وہ جدید ٹکنالوجی پر منحصر سماج کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ ریاضی ہماری عمومی تعلیم کے نصاب کا ایک لازمی بنیادی مضمون ہے۔ معاشرے کی ترقی میں ریاضی کا کردار میں ریاضی کا کردار کو سراہنے کے لیے، ہمیں مندرجہ ذیل نکات کو سمجھنا ضروری ہے۔

- ریاضی کیا ہے؟
- ریاضی کی اہمیت کیا ہے؟
- ترقی کیا ہے؟
- کیا بدلتی دنیا میں ریاضی کی کوئی ضرورت ہے؟
- معاشرے کی ترقی میں ریاضی کا کیا کردار ہے؟

ریاضی کیا ہے؟

ریاضی، انسانی زندگی اور انسانی معلومات کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ انسانوں کو ان کے خیالات، تصورات اور فیصلوں کی درست تشریح کرنے میں مدد کرتی ہے۔ یہ مقام وشکل سے متعلق مسائل کو حل کرتی ہے یہ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ فضا (Space) میں مختلف غیر معمولی واقعات یا قدرتی مظاہر (Natural phenomenans) کو سمجھ سکے اور ان کے درمیان مختلف رابطے بنا سکے۔

ریاضی ایک زبان کی مانند ہے جس کا اپنا ذخیرہ الفاظ یا فرہنگ ہے اور اپنی قواعد (گرامر) ہے۔ اس فرہنگ میں تصورات، اصطلاحات، حقائق، مفروضات اور علامات وغیرہ شامل ہیں، جب کہ قواعد اصول و ضوابط اور اعمال وغیرہ پر مبنی ہوتی ہے۔

ریاضی کے لغوی معنی اعداد و مقدار، مقام، رقبہ اور حجم سے متعلق سائنس یا پیمائش کے ہیں۔ ریاضی کی تعریف اس طرح سے بھی کی جاسکتی ہے کہ 'ریاضی مقدار ناپ تول اور مکانی رشتوں کی سائنس ہے'۔

ریاضی کی کچھ اہم تعریفیں حسب ذیل ہیں:

1۔"ریاضی ایک سائنس ہے جس کا مواد اصل دنیا کی مقداری نسبتوں کی مخصوص شکل ہے"۔ فیڈرک اینگل (Friedrich Engel)

2۔ ریاضی وہ سائنس ہے، جو ضروری نتائج اخذ کرتی ہے"۔ چارلس سینڈرس پیرسے (Charles Sanders-Pierce)

3۔ ریاضی اپنے وسیع معنوں میں تمام قسم کی واضح استخراجی استدلال (Deductive Reasoning) کی نشو و نما ہے۔ اے این وائٹ ہیڈ (Whitehead.A.N)۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاضی صرف گننے کا عمل یا اعداد و شمار کی جمع و تفریق ہی نہیں ہے بلکہ یہ اس سے آگے بڑھ کر نتیجے اخذ کرنے یا تعمیم کرنے، نسبتوں کو دیکھنے اور منطقی فکر و فہم اور استدلال کو بڑھانے میں مددگار ہوتی ہے۔ عام زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاضی کی ابتدا اعداد سے ہوئی ہے اور عددی نظام ہی اس کا اولین و خاص میدان (Special Field) ہے۔ یہ علم الحساب ہے۔

ریاضی کی اہمیت:

ریاضی کی ابتدا واقعات (صبح شام، موسم کی تبدیلی وغیرہ) اور ذخیرہ (مویشی اور دیگر سامان) کا حساب رکھنے کی شکل میں کنکریوں کے ڈھیر یا لائنوں کی شکل میں ہوئی جس کو بعد میں اعداد کی شکل میں محفوظ کیا گیا۔ اس طرح ریاضی کی ابتدا اعداد اور ان کے حساب سے ہوئی اور اسے علم الحساب کا نام دیا گیا۔ لفظ ریاضی کے لغوی معنی" چیزوں کو گننے کا عمل یا اعداد و شمار کی جمع و تفریق" کے ہیں۔ اب آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں گنتی کی کتنی اہمیت ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ اگر ریاضی بالکل نہیں ہوتی تو کیا ہمارے لیے یہ ممکن ہوتا کہ ہم کنبہ کے ممبران، کلاس میں طلباء کی تعداد، جیب میں رکھے روپے، کرکٹ میچ میں بننے والے رن، ایک ہفتہ میں یا مہینوں میں دنوں کا پتہ لگا پاتے؟ عام زندگی میں آپ کو چیزوں کو گننے، جوڑنے، گھٹانے، ضرب لگانے اور تقسیم کرنے کے قابل ہونے کی ضرورت ہے۔

نفسیاتی سطح پر، ریاضی کے انکشاف (ایکسپوژر) سے تجزیاتی ذہن تیار کرنے میں مدد ملتی ہے اور خیالات کی بہتر تنظیم اور خیالات کے درست اظہار میں مدد ملتی ہے۔ زیادہ عام سطح پر، اعلیٰ ریاضی کے تصورات سے نمٹنے سے بہت دور، ایک عام آدمی کے لیے ریاضی کی اہمیت کو کم سمجھا جاتا ہے۔ ایک عام آدمی روزمرہ کی زندگی کی سرگرمیوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال پر بہت زیادہ انحصار کرتا جارہا ہے، بلاشبہ ریاضی ہمارے آس پاس ہے اور ہماری زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ یہ مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ صبح اٹھنے کے الارم بجنے سے لے کر، گھڑی پر وقت دیکھنے، کیلنڈر پر تاریخ دیکھنے، فون اٹھانے، باورچی خانے میں کھانا تیار کرنے، کوکر کی سیٹیوں کی گنتی کرنے، رقم کا انتظام کرنے، کسی جگہ کے سفر کی تیاری کرنے، اپنی گاڑی کا مائلیج چیک کرنے، فلنگ اسٹیشن پر رکنے، اسکول میں رول کال پر حاضر ہونے، کلاس کے امتحانات میں نمبر حاصل کرنے، یہاں تک کہ نئے دوستوں سے ملاقات بھی اس فہرست میں شامل ہے جہاں ریاضی استعمال ہوتی ہے۔ تقریباً ہر اگلے لمحے ہم آسان حساب کتاب کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ بہت ہی لاشعوری طور پر کیا جاتا ہے بغیر ایسے سوچے ہوئے کہ ایسے تمام مواقع پر ہم ریاضی کا استعمال کر رہے ہیں۔

یہاں تک کہ جب ہم اپنی تفریحی سرگرمیوں میں ریاضی کے استعمال کے بارے میں سوچتے ہیں تو، ہم پہلے ایک فہرست تیار کرتے ہیں، جو کافی طویل چلتی ہے: ویڈیو گیمز، کمپیوٹر گیمز، پہیلیاں، مختلف کھیل جیسے ہاکی، کرکٹ، کھو کھو، کبڈی، فٹ بال، باسکٹ بال وغیرہ۔ ان سارے کھیلوں میں کھیل کے میدان (جگہ) سے متعلق ایک آگہی شعور اور استعمال کی ضرورت ہے۔ کراس ورڈ کھیلتے وقت ہمیں جو الفاظ بنانے ہوتے ہیں ان کی لمبائی، مشترکہ حروف وغیرہ کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شطرنج جیسے بورڈ گیمز کے بارے میں کیا خیال ہے؟ شطرنج کھیلتے ہوئے، آپ کو جیتنے کی حکمت عملی کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے۔ اس میں آپ کو کسی بھی وقت ممکنہ تحریک تعمیر کرنے کی ضرورت ہے، ان شرائط کو پیش کرتے ہوئے جن کے تحت مختلف ٹکڑوں کو منتقل کرنے کی اجازت ہے۔ لوڈو، چوپڑ، تجارت اور اس طرح کے دیگر کھیلوں میں، کھلاڑی ریاضی کا بہت استعمال کرتے ہیں۔ حساب کتاب ، یا دوسرے لفظوں میں ریاضی کے علم کے بغیر زندگی کے بارے میں سوچنا کسی حد تک ہمیں خوفزدہ کرتا ہے۔ ریاضی ہماری روزمرہ کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے اور یہ ہماری موجودہ دور کی دنیا کی ترقی کا ایک ناگزیر عنصر ہے۔

قدرت پر اگر نظر ڈالیں تو وہاں بھی ریاضی ہم کو نظر آئے گی ہمارے چاروں طرف بہت سے نمونے اور چیزوں میں تشاکل (Symmetry) نظر آتے ہیں۔ پیڑ پودوں، پھولوں، پتوں، فوک ڈرائنگ اور کپڑوں کے ڈیزائن میں بھی یہی تشاکل اور نمونے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کی مثالیں ہم کو جانوروں میں بھی ملتی ہیں۔ کبھی آپ نے چیتے پر بنے نشانات یا زیبرے پر بنی لائنوں پر غور کیا ہے؟ یہاں پر بھی آپ کو ایک پیٹرن نظر آئے گا۔ سورج کا نکلنا و غروب ہونا اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ ستارے بھی طے شدہ وقت پر نکلتے ہیں۔ علم ہیئت (Astronomy) اور طبیعیات جیسی فطری سائنس کا ارتقا علم ریاضی کا ہی مرہون منت ہے۔

ریاضی کی اہمیت کوگیلیلیو کی دی گئی تعریف سے سمجھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ریاضی کی تعریف کچھ اس طرح دی ہے، 'ریاضی وہ زبان ہے جس میں خدانے اس دنیا کولکھا ہے۔'

ترقی کیاہے؟

ریاضی کے معنی سمجھنے کے بعد یہاں لفظ ترقی کو سمجھنا ضروری ہے۔ہم ترقی کی اصطلاح کوعلم کی ترقی یاایک ایسے عمل سے سمجھ سکتے ہیں جس میں چیزیں ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں، خاص طور پر زیادہ اعلی درجے کی طرف کے مرحلے یاپختہ مرحلے سے گزرتی ہیں۔اس کے علاوہ ترقی کومخصوص مقاصد یاضروریات کو پورا کرنے کے لیے سائنسی اور تکنیکی علم کے منظم استعمال یا کسی تصور، ڈیزائن، دریافت یا ایجاد کے نظریاتی یا عملی پہلوؤں کی توسیع یا معاشی اور معاشرتی تبدیلی کا ایک ایسا عمل جو پیچیدہ ثقافتی اور ماحولیاتی عوامل اوران کے تعامل پر مبنی ہو یا کسی جگہ یازمین کو بہتر کرنے کے عمل سے بھی سمجھ سکتے ہیں، جیسے گریڈنگ، پانی کی نکاسی، سڑکیں اوردوسری سہولیات وغیرہ۔ یاہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نامعلوم چیزوں یاعلم کومعلوم کرنے یااس کے اظہار کرنے کا عمل یاکسی بھی چیز کوتیار کرنے کے عمل کو منظرعام پرلانا ترقی کہلاتا ہے۔

ہم غیر معمولی حدتک تیز رفتار سے بدلنے والے وقت میں رہ رہے ہیں۔نئ معلومات، آلات اور ریاضیائی مسائل کوحل کرنے اوراس کا اظہار کرنے کے لیے مستقل نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں۔ کیلکیولیٹر (Calculator) جو اٹھارہویں صدی کی شروعات میں عام استعمال کے لیے بہت مہنگااور ناقابل حصول تھا آج نہ صرف سستااور عام جگہوں پر دستیاب ہونے لگا ہے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور فعال بھی ہوگیا ہے۔ کچھ دن پہلے تک مقداری (Quantitative) معلومات صرف چند ہی لوگوں تک محدود ہوتی تھی مگر آج کی دنیا میں یہ میڈیا کی بدولت عام ہوگئی ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ ترقی میں ریاضی کا کیا کردار ہے؟ معاشی اور معاشرتی ترقی میں ریاضی کے کردار کوسمجھنے کے لیے پہلے ہمیں ترقی یافتہ اور بدلتی دنیا میں ریاضی کی ضرورت کودیکھنا ہوگا۔

بدلتی ہوئی دنیامیں ریاضی کی ضرورت:

آج روزمرہ زندگی میں اوراپنے کام کرنے کی جگہوں پر ریاضی کو نہ صرف سمجھنا بلکہ اس کواستعمال کرنے کے قابل ہونے کی بھی ضرورت ہے اور یہ ضرورت روز بروز بڑھ رہی ہے۔اس کو ذیل میں دی گئی چند نکات کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے۔

ریاضی،زندگی کے لیے:

ریاضی کی معلومات نہ صرف اپنے آپ کوحسب ضرورت تسلی بخش اورمضبوط بنانے کے لیے ضروری ہے بلکہ روزمرہ زندگی کے کام کاج بھی روز بروز ریاضی اورٹیکنالوجی پر منحصر ہوتے جارہے ہیں۔مثال کے طور پر صبح اُٹھ کر دن بھر کے کاموں کی منصوبہ بندی کے لیے وقت کا تعین کرتے وقت، خرید وفروخت کرتے وقت، صحت وزندگی کے بیمہ پلان لیتے وقت اور دانشمندی سے ووٹ دینے تک میں ریاضی کی ضرورت ہوتی ہے۔ "زندگی کا کوئی شعبہ ایسانہیں ہے جہاں اعداد وشمار کسی نہ کسی صورت میں ہمارے سامنے نہ ہوں" کیا آپ اِس بیان کوغلط ثابت کرسکتے ہیں؟

ریاضی ثقافتی میراث کےطور پر:

ریاضی انسان کا ایک عظیم اور دانشورانہ کارنامہ ہے۔ہمارے ملک ہندوستان کی ثقافتی میراث میں علم نجوم، فلکیاتی علم، عددی نظام اور سب سے اہم صفر کی دریافت شامل ہے۔تمام شہریوں کوان کارناموں کو سمجھنا چاہیے اور سراہنا چاہیے اور ساتھ ہی اس کے نفیس اور فرحت انگیز پہلوؤں سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔

ریاضی پیشہ ورانہ مقامات پراستعمال کے لیے:

جس طرح سے ایک سمجھ دار شہری کے لیے ریاضی کی ضرورت میں اضافہ ہوا ہے بالکل اسی طرح دفاتر اور پیشہ وارانہ جگہوں پر بھی مسائل کو حل کرنے کی ضرورت کے تحت ریاضی کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔

ریاضی ایک سائنٹفک اور تکنیکی معاشرے کے لیے:

تقریباً سبھی پیشوں کے لیے بنیادی ریاضیائی معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے کچھ میں ریاضی کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ زیادہ تر طلبا ایسا تعلیمی راستہ چننا چاہتے ہیں جوانھیں آگے چل کرایک ریاضی داں، اعداد وشمار کا ماہر، انجینئر، ڈاکٹر ایک کامیاب تاجر، معاشیات داں یاپھر سائنس داں بننے میں مددگار ثابت ہو۔اس بدلتی دنیا میں جولوگ ریاضی کوسمجھتے ہیں اوراس کا استعمال کرسکتے ہیں ان کے لیے یقیناً اپنے مستقبل کوسنوارنے کے بہت زیادہ مواقع ہیں۔ ریاضیائی صلاحیتیں مستقبل کے دروازے کھولتی ہیں اور ریاضیائی صلاحیتوں کی کمی ان دروازوں کوکھولنے میں مشکلات کا باعث بنتی ہے۔اس لیے ہرکسی کوریاضی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سبھی طلبا کو یہ مواقع ملنے چاہئیں کہ وہ ریاضی کو پوری گہرائی اور سمجھ کے ساتھ پڑھیں۔ ریاضی کی سمجھ اور مہارت کے بغیر ان کوکسی بھی شعبہ میں کامیابی حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا پڑسکتا ہے۔ سبھی طلبا کوریاضی کی یکساں بنیادی تعلیم دینے کے لیے کچھ اصول

اور معیار بنائے گئے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سبھی طلبا ایک سے ہیں۔ مختلف طلبا ریاضی کی مختلف صلاحیتیں، لیاقتیں، کارنامے، ضروریات و شوق رکھتے ہیں لیکن پھر بھی تمام طلبا کو بہترین قسم کی ریاضیائی تدریسی پروگرام کے مواقع فراہم ہونے چاہئیں وہ طلبا جو آگے چل کر ریاضی اور سائنس کو ہی اپنے پیشہ ورانہ زندگی کے لیے چننا چاہتے ہیں ان کی صلاحیتیں، لیاقتیں اور دلچسپیاں بھی اس کے مطابق ہونی چاہئیں۔ اسی طرح وہ طلبا جن کی تعلیمی ضروریات کچھ خاص قسم کی ہیں ان کو بھی ضروری ریاضیائی سمجھ پیدا کرنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔ ایک ایسا سماج جس میں صرف چندلوگوں کو ہی ریاضی کی معلومات ہو وہاں کے معاشی، سیاسی اور سائنٹفک کردار وہاں کی معاشی ضرورت یا جمہوری نظام کی قدروں کے ساتھ متوازن نہیں ہوگا۔

معاشرے کی ترقی میں ریاضی کا کردار کیا ہے؟

ایک معاشرہ، یا ایک انسانی معاشرہ، افراد کا ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جہاں افراد ایک دوسرے سے مستقل تعلقات کے ذریعہ وابستہ ہوتا ہے اور ایک ہی جغرافیائی علاقہ میں رہتے ہیں، اور کسی ایک سیاسی اتھارٹی اور ثقافتی توقعات کے تابع ہوں۔ مزید واضح طور پر، معاشرے کو معاشی، معاشرتی یا صنعتی انفراسٹرکچر کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے، جو افراد کے مجموعہ سے بنا ہوا ہو۔

ریاضی، انسانی معاشروں میں ایک اہم اور انوکھا کردار ادا کرتی ہے اور پوری انسانیت کی ترقی میں ایک حکمت عملی کی نمائندگی کرتی ہے۔ گنتی کرنے کی صلاحیت، ٹکنالوجی کی طاقت اور معاشرتی تنظیم کی قابلیت سے وابستہ ہے، اور خلاء میں جیومیٹریائی تفہیم، جو طبیعاتی دنیا اور اس کا فطری نمونہ ہے، ایک سوسائٹی کی ترقی میں ریاضی کے کردار کو ظاہر کرتی ہے۔ معاشرہ اپنے افراد پر مشتمل ہے، جو حکومت بناتے ہیں اور انفراسٹرکچر کی ترقی کے لیے قدرتی وسائل کو منظم کرتے ہیں۔ انسان ہی وہ ہے جس نے معاشرے کی ترقی کی۔ لہٰذا، ہم معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ کسی فرد کی ترقی میں ریاضی کے کردار پر تبادلہ خیال کریں گے۔

کسی فرد اور معاشرے کی ترقی میں ریاضی کے کردار کو سمجھنے کے لیے ہمیں مندرجہ ذیل بات چیت کرنے کی ضرورت ہے۔

ذاتی سطح پر:

ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاشرتی ترقی، فکری ترقی، پیشہ ورانہ ترقی، اخلاقی ترقی، روحانی ترقی اور ثقافتی ترقی سے ہی کسی شخص کی ذاتی ترقی ہوتی ہے۔

معاشرتی سطح پر:

نظام تعلیم، معاشیات، انفراسٹرکچر، سائنس اور ترقی، میڈیکل سائنس، زرعی میدان، ثقافتی اور اخلاقیات، معیار زندگی کی ترقی ہی معاشرتی ترقی کی ضامن ہے۔

پہلے ہم ذاتی سطح پر ریاضی کے کردار پر تبادلہ خیال کریں گے۔

1۔ معاشرتی ترقی میں ریاضی کا کردار:

انسان ایک معاشرتی مخلوق ہے اور انسانی زندگی کا انحصار ایک دوسرے کے تعاون پر ہے۔ اجتماعی کام معاشرتی مہارت میں مدد کرتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ کاموں پر مل کر کام کرنے کی صلاحیت مختلف معاشرتی مہارتیں پیدا کرسکتی ہے۔ معاشرتی زندگی کے لیے ریاضی کے علم کی ضرورت ہے، کیونکہ دینے اور لینے کے عمل کی وجہ سے، کاروبار اور صنعت ریاضی کے علم پر ہی منحصر ہے۔ جدید سہولیات جیسے ذرائع نقل وحمل، مواصلات کے ذرائع اور سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی وغیرہ کی وجہ سے ہونے والی معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی صرف ریاضی کی وجہ سے ہے۔ اس طرح ریاضی نے نہ صرف معاشرے کی ترقی کو سمجھنے میں بلکہ معاشرے کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

2۔ فکری ترقی میں ریاضی کا کردار:

ذہنی نشوونما کے لیے ریاضی کی تعلیم بہت ضروری ہے نصاب میں ریاضی کی طرح کوئی دوسرا مضمون نہیں ہے جس سے طلباء کا ذہن اتنا متحرک ہوجاتا ہے۔ مسئلہ کو حل کرنے سے ذہنی صلاحیتوں کی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ ریاضی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ذہنی کام کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی بچہ، ریاضی کا مسئلہ حل کرتا ہے تو اس کا ذہن اس مسئلے کو حل کرنے میں سرگرم ہوجاتا ہے۔ ریاضی کا ہر مسئلہ اسی طرح کا ہوتا ہے جو تعمیری اور تخلیقی عمل کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح سے، ریاضی کے ذریعہ بچے کی تمام ذہنی صلاحیتیں تیار ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی، ریاضی آدمی کو بہت حساب کتاب کرنا سکھا دیتی ہے تاکہ وہ نہ صرف اپنا وقت، رقم، بلکہ الفاظ بھی سوچ سمجھ کر استعمال کریں۔ اس سے مضبوط قوت ارادی، صبر اور خود انحصاری پیدا ہوتی ہے۔ یہ، دریافت اور ایجاد کی ذہنی صلاحیت کو بھی تیار کرتا ہے۔

3۔ پیشہ ورانہ ترقی میں ریاضی کا کردار:

تعلیم کا بنیادی مقصد بچوں کو اپنی اپنی روزی کمانے کے قابل بنانا اور انھیں خود مختار بنانا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ریاضی کسی بھی دوسرے مضمون کے مقابلے میں سب سے اہم مضمون ہے۔ اس (اس مقصد) سے طلبا کو ایسے تکنیکی اور دیگر پیشے کے لیے تیار کرنے میں مدد ملتی ہے جہاں ریاضی کا اطلاق ہوتا ہے جیسے۔ انجینئرنگ، فن تعمیر، اکاؤنٹنسی،

بینکنگ، کاروبار، یہاں تک کہ زراعت، ٹیلرنگ، کارپینٹری، سروے، اور دفتر کے کام کے لیے ریاضی کے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

4۔اخلاقی ترقی میں ریاضی کا کردار:

اخلاقیات زندگی کا ایک اہم مرحلہ ہے، جو زیادہ تر، وقت، فرد، صورتحال اور جگہ سے متاثر ہوتا ہے۔ایک مضمون کے طور پر، ریاضی طلباء کی اخلاقی نشوونما میں اضافہ کرسکتا ہے کیونکہ ریاضی کا علم کردار اور شخصیت کی نشوونما میں معاون ہے۔اس سے وہ تمام اقدار پیدا ہوتی ہے جن کا مضبوط کردار والے شخص کے پاس ہونا ضروری ہے۔

5۔روحانی ترقی میں ریاضی کا کردار:

ریاضی کی ایک اہم صلاحیت عکاسی (ریفلیکشن) کی صلاحیتوں کو تیار کرنا ہے اور مسئلہ کے کسی حل کی خوبصورتی کے احساس کے بارے میں ہے۔کسی کو ریاضی کے مسائل حل کرنے میں جو خوشی ملتی ہے، خاص طور پر جب کسی مسئلے کا صحیح جواب ملتا ہے .اس لمحے میں ہر بچہ مطمئن، اعتماد اور خود انحصاری محسوس کرتا ہے .یعنی بچے کو قابل ذکر کامیابیوں کے حصول میں حوصلہ، اطمینان اور خوشی ملتی ہے۔لہذا ریاضی ان کی جمالیاتی حساسیت کو فروغ دینے میں مدد کرتی ہے، مختلف دلچسپیوں کو پورا کرتی ہے اور ان کے تفریحی وقت کے صحیح استعمال میں ان کی مدد کرتی ہے۔

6۔ثقافتی ترقی میں ریاضی کا کردار:

سماج کے کسی بھی فرد کے رویے کا مطالعہ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک ہم اس سماج کا مطالعہ نہ کرلیں جس میں ہم رہتے ہیں۔ہم سماج میں کس طرح رہتے ہیں، کیا اور کیسے کھاتے پیتے ہیں، کیا پہنتے ہیں، کیسے برتاؤ کرتے ہیں وغیرہ ہماری تہذیب کے حصے ہیں اور یہ ساری چیزیں ہمارے سماج یا ہماری تہذیب کی ترقی کو ظاہر کرتی ہیں۔جس میں ریاضی کا ایک اہم رول ہے۔ریاضی ہر ملک کے ثقافتی ورثہ سے بہت قریبی طور پر وابستہ ہوتی ہے۔ہمارے ملک کا بھی ایک ریاضیائی ورثہ ہے جس پر ہم کو بہت فخر ہے۔دنیا بھر میں استعمال ہونے والا صفر ہو یا عددی نظام ہو، ہمارے قدیم ہندوستانی ریاضی دانوں کا ہی تحفہ ہے۔فلکیات کا علم، علمِ نجوم وغیرہ ہماری خاص پہچان رہی ہیں۔یہاں تک کہ عوام میں فلکیات اور علمِ نجوم سے متعلق شوق پیدا کرنے کے لیے دہلی میں جنتر منتر تعمیر کروایا گیا تاکہ عوام ستاروں کی گردش کا مطالعہ کرسکیں۔ہماری عمارتیں جن میں تاج محل قطب مینار، قدیم مندر، جگن ناتھ کا مندر ایسے مقامات ہیں جہاں توازن اور تناسب کا بہترین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے ان کی تعمیرات میں ریاضیائی اصولوں کو مدنظر رکھا جاسکتا ہے۔

بچوں کو تہذیب اور ثقافت کی ترقی میں ریاضی کی شراکت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ساتھ ہی فنون لطیفہ اور انسانی زندگی کو خوبصورت بنانے میں ریاضی کے کردار کو سمجھنے کے قابل بنایا ہے۔

معاشرتی سطح پر:

ایک معاشرے کی ترقی کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر زور دینے کی ضرورت ہے۔

1۔نظام تعلیم کی ترقی میں ریاضی کا کردار:

نظام تعلیم میں، ریاضی نوجوانوں کے مستقبل کے امکانات کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

کسی فرد کی نشوونما میں تعلیم اہم کردار ادا کرتی ہے، اسے خودمختار بناتی ہے، اسے سمجھدار بناتی ہے، اسے معاشرہ میں مدد کرنا سکھاتی ہے۔ہمارے تعلیمی نظام میں، تقریباً ہر اس مضمون کی طرح جو ہم اسکول اور یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں، اسی طرح ہمیں ریاضی کا بھی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے جو دیگر مضامین کی سمجھ پیدا کرنے میں مدد کرتی ہے جیسے، طبیعیات، کیمسٹری، زندگی سائنس، معاشیات، کاروبار اور حساب کتاب، جغرافیہ، تاریخ، نفسیات، آرکیٹیکٹ، ڈیزائننگ، کمپیوٹس، شماریات، کامرس وغیرہ۔

اس کے علاوہ پیشہ ورانہ شعبوں جیسے ٹیلرنگ، کارپینٹنگ، کھانا پکانے سے متعلق کام، بیوٹیشنز، اسپورٹس پرسن، فارمنگ وغیرہ میں بھی ریاضی کے علم کی ضرورت ہے۔یہاں تک کہ، کنڈکٹر، شاپ کیپر، ڈرائیور، موسیقار، جادوگر، کیشیئر وغیرہ جیسے پیشوں میں بھی ریاضی کے بنیادی تصورات کا استعمال کرتے ہیں۔

ریاضی خلاصہ (ابسٹر اکشن)، عمومیت (جنرلائزیشن) اور ترکیب (سینتھسس) کے لیے ایک طاقتور عالمی زبان اور فکری ٹول کٹ فراہم کرتا ہے۔یہ سائنس اور ٹکنالوجی کی زبان ہے۔اس سے ہمیں قدرتی کائنات کی تحقیقات کرنے اور نئی ٹیکنالوجی تیار کرنے میں مدد ملتی ہے جس نے ہمارے ماحول کو کنٹرول کرنے اور اس میں عبور حاصل کرنے، اور معاشرتی توقعات اور معیار زندگی کو تبدیل کرنے میں مدد کی ہے۔ریاضی کی مہارت کی انتہائی قدر کی جاتی ہے اور اس کی تلاش کی جاتی ہے۔ریاضی کی تربیت ذہن کو ڈسپلن کرتی ہے، منطقی اور تنقیدی استدلال کی نشوونما کرتی ہے، اور تجزیاتی اور مسئلہ حل کرنے کی مہارت کو اعلی پیمانے تک تیار کرتی ہے۔

2۔اقتصادیات کی ترقی میں ریاضی کا کردار:

جدید معاشرے میں ریاضی کی مرکزی اہمیت ہے۔یہ معیشت

کے علم کی بنیادی واہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ یہ طبعی سائنس، ٹکنالوجی، کاروبار اور آئی سی ٹی کے بہت سے شعبوں کے لیے ضروری ہے۔ حیاتیات، طب اور بہت سارے معاشرتی علوم میں بھی اس کی اہمیت بہت بڑھی ہے۔ ریاضی سب سے زیادہ سائنسی اور صنعتی تحقیق اور ترقی کی اساس تشکیل دیتی ہے۔ جدید دنیا میں بہت سارے پیچیدہ نظام اور ڈھانچے کو صرف ریاضی کا استعمال کرتے ہوئے سمجھا جاسکتا ہے اور اعلیٰ ٹکنالوجی کے نظام کا زیادہ تر ڈیزائن اور کنٹرول ریاضی پر منحصر ہے۔

معاشرے کی معاشیات صنعتوں کے قیام سے تیار ہوتی ہیں۔ صنعتی میدان میں عملی ریاضی جیسے کمپیوٹیشنل سائنس، اطلاق تجزیہ، اصلاح، تفریق مساوات، اور ڈیٹا کا تجزیہ وغیرہ ضروری ہیں۔ ریاضی کے طریقوں کے استعمال سے، تیل کی لاگت اور مواصلات کی لاگت اور بجلی بنانے کی لاگت کو کم کیا جاسکتا ہے۔

3۔ انفراسٹرکچر کی ترقی میں ریاضی کا کردار:

ریاضی نے ہزاروں سالوں سے سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اب بھی یہ کام جاری ہے۔ کاروبار، صنعت، موسیقی، تاریخی وظائف، سیاست، کھیل، طب، زراعت، انجینئرنگ، اور معاشرتی اور قدرتی علوم میں مفید اطلاقات پائی جاتی ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں انفراسٹرکچر کی طبعی شکل اور نشوونما بہت ضروری ہے۔ اس طرح، مکینیکل انجینئرنگ، سول انجینئرنگ، الیکٹریکل انجینئرنگ وغیرہ میں سڑکیں، عمارتیں، اسٹیڈیم، فلائی اوور، ہوائی اڈے، ڈیم، پل، گاڑیاں، ہوائی جہاز وغیرہ کی تعمیر میں بھی ریاضی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔

4۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی میں ریاضی کا کردار:

ریاضی کا "عملی" پہلو سائنس، ٹکنالوجی اور انجینئرنگ کی زبان کی حیثیت سے اور ان کی ترقی میں اس کے کردار کی اہمیت کی وجہ سے ہے۔ یہ شمولیت اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ ریاضی خود ہے اور یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ، ریاضی کے بغیر نہ تو سائنس ہوسکتی ہے اور نہ ہی انجینئرنگ۔ جدید دور میں، معاشرتی، طبی اور طبعی علوم میں ریاضی کا استعمال اور تیزی سے پھیل گیا ہے۔ اسی لیے ریاضی کو اسکول کے تمام نصاب کا ایک لازمی حصہ تسلیم کیا جاتا ہے اور یونیورسٹی کی سطح پر بھی ریاضی کی تربیت کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ اس کا زیادہ تر مطالبہ ریاضی اور شماریاتی ماڈلنگ کی ضرورت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس طرح کی ماڈلنگ تمام انجینئرنگ کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے، تمام طبعی علوم میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے اور حیاتیاتی علوم، طب، نفسیات، معاشیات اور تجارت میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی میں ریاضی کو 20 ویں صدی اور 21 ویں صدی میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ جدید سیمی کنڈکٹر ڈیوائسز، بائیوٹکنالوجی، ڈیجیٹل امیج ٹکنالوجی، نینوٹکنالوجی، مصنوعی سیارہ، اور راکٹ وغیرہ کے میدان ریاضی کے تصورات پر مبنی ہیں۔ ناسا کی مارس روور کی حالیہ کامیابی بھی ریاضی پر مبنی ہے۔

:5۔ میڈیکل سائنس اور زرعی شعبے کی ترقی میں ریاضی کا کردار

زراعت، ماحولیات، وبائیات، ٹیومر اور کارڈیک ماڈلنگ، ڈی این اے ترتیب اور جین ٹیکنالوجی میں ریاضی کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ طبی آلات اور تشخیص، آپٹو الیکٹرانکس اور سینسر ٹکنالوجی تیار کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ایسے بہت سی جگہیں ہیں جن میں ریاضی بہت خاص کردار ادا کرتی ہے۔ اس کی پہلی وجہ، ریاضی کی اپنی بنیادی نوعیت کی بنا پر ایک آفاقی زبان کی حیثیت سے ہے اور سائنس، ٹکنالوجی اور انجینئرنگ میں اس کی بنیادی ساخت کی وجہ سے، ریاضی کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دوسرے بہت سے مضامین سے فطری طور پر مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری وجہ، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، ریاضی بنیادی طور پر ایک کام کرنے والے مقام اور انفرادی طور پر ہر فرد، دونوں کے لیے ہی ایک وسیع پیمانے پر اہمیت رکھتی ہے۔

6۔ ثقافتی اور اخلاقی ترقی میں ریاضی کا کردار:

ریاضی اپنے آپ میں ایک بہت ہی خوبصورت اور جمالیاتی حسن رکھتی ہے، لیکن اس کا ثقافتی کردار بنیادی طور پر اس کی سمجھی جانے والی تعلیمی خوبیوں کی وجہ سے ہے۔ ریاضی کی کامیابیوں اور ڈھانچے کو انسانی نوع کی سب سے بڑی فکری کامیابیوں میں سے ایک کامیابی کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے انھیں اپنے طور پر مطالعے کے قابل سمجھا جاتا ہے، جبکہ منطقی استدلال پر ریاضی کا بھاری انحصار تعلیمی قابلیت کا حامل ہے جو ایک ایسی دنیا میں جہاں عقلی سوچ اور طرز عمل کی بہت زیادہ قدر کی جاتی ہے۔ مزید برآں ریاضی کے مطالعے سے عقل اور مسئلے کو حل کرنے کی صلاحیتوں کو تیز کرنے کی صلاحیت کو بھی دانشمندی اور دانشورانہ صلاحیتوں کے حصول کے عمومی مقاصد میں نمایاں کردار ادا کرنے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

ایک مہذب شہری وہ ہوتا ہے جو معاشرے کے اصولوں پر عمل پیرا ہو اور جو تہذیب یافتہ ہو۔ ایک اچھے سلوک والا شخص ہمیشہ سادہ، صبر کرنے والا، ایماندار، درست اور نظم وضبط والا ہوتا ہے۔ اور ریاضی ایک ایسا مضمون ہے جو درست، بالکل صحیح اور اصل ہے، اور جو ریاضی کا مطالعہ

کرتا ہے اسے ان قوانین اور قواعد پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس طرح، ریاضی لوگوں کو اچھے اخلاق رکھنے والے مہذب شہری بننے میں لوگوں کی مدد کرتا ہے۔

7۔رہائشی معیار کی ترقی میں ریاضی کا کردار:

ریاضی، کیونکہ تقریباً ہر پیشے میں استعمال ہوتی ہے، اس لیے یہ کسی شخص کے معیار زندگی کو بہتر بنانے میں بہت مدد کرتی ہے۔ معاشیات، سائنس اور ٹکنالوجی، اور میڈیسن وغیرہ میں ترقی یعنی معاشرے کی ترقی ہی زندگی کے معیار کو ترقی دیتی ہے۔ اس طرح، ریاضی معیار زندگی کو بلند کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگرچہ تمام شعبوں میں انفارمیشن ٹکنالوجی کے بہت زیادہ استعمال نے مطلوبہ ریاضی کی صلاحیتوں کی نوعیت کو تبدیل کر دیا ہے، لیکن اس نے ریاضی کی ضرورت کو کم نہیں کیا ہے۔

عورتوں کو بااختیار بنائے بغیر کسی بھی معاشرے کی ترقی کبھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ خواتین معاشرے کا آدھا حصہ ہے۔ لہذا، ہم خواتین کو بااختیار بنانے میں ریاضی کی تعلیم کے کردار کو بھی دیکھیں گے۔

8۔خواتین کو بااختیار بنانے میں ریاضی کی تعلیم کا کردار:

سائنس اور ٹکنالوجی کے ایک آلے کے طور پر ریاضی کی اہمیت میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ سائنس اور ٹکنالوجی اس قدر وسیع ہو چکی ہے، اس لیے ریاضی کی تعلیم نے اسکول کے نصاب پر غلبہ حاصل کیا ہے اور یہ اعلی تعلیم اور روزگار کے شعبے میں کلیدی موضوع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اسکولوں کے ریاضی کے نتائج کی اشاعت کے بعد ہنگامہ ہونا ایک سالانہ رسم بن گئی ہے۔ نتائج کے بارے میں تفصیل سے جاننے پر پتہ چلتا ہے کہ طالبات بھی پیچھے رہ گئی ہیں۔ اس سے کام کرنے والی دنیا میں خواتین کے ذریعہ تلاش کیے جانے والے کورسز اور کیریئر پر بھی اثر پڑا ہے۔ انھوں نے متوقع معیار کے مطابق کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں اپنی ناکامی کو ریاضی کے علم کی کمی سے منسوب کیا ہے۔ یہ ایک احساس ہی ہے کہ پیداواری شہریوں کے معاملے میں معاشرے کو جس چیز کی ضرورت ہے اس پر، اسکول میں حاصل ہوئی مہارتوں کا بہت کم اثر پڑتا ہے۔ اسکول کی سطح، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے، اندراج میں اور روزگار کے شعبے میں صنفی عدم توازن تشویش کا باعث ہے۔ ہمارے معاشرے ریاضی کی تعصب کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تکنیکی ہوتے جا رہے ہیں، اور زیادہ توجہ ریاضی کی اہلیتوں کے حصول پر مرکوز ہے۔

خواتین کو بااختیار بنانے سے ان کو اپنے علم اور پیشہ ورانہ مہارتوں کو بڑھانے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں یہ بااختیاری خواتین کی بقا کے لیے اور خواتین کے لیے زیادہ کاروباری پیشہ ور راستوں تک رسائی کو بھی بہتر بناتی ہے۔ اندراج، کارکردگی، مضامین اور وہ ملازمتیں جن میں ریاضی کا رجحان ہے ان میں جو عدم توازن پایا جاتا ہے اس خلا کو دور کرنے کے لیے مداخلتی پروگراموں کی ضرورت پر زور دیا گیا جبکہ اس نے تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے طریقہ کار کے طور پر نصاب میں اصلاحات کی ضرورت کا انکشاف کیا۔ اسی طرح کی تبدیلیاں ان اصلاحات کے ساتھ موزوں نظر آتی ہیں تاکہ سیکھنے کے لیے ایک جامع نقطہ نظر کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس سے خواتین نے کیریئر کے انتخاب میں مدد فراہم کرنے میں ریاضی کی تعلیم ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مختلف تحقیقوں سے پتہ چلتا ہے جو یہ دیکھنے کے لیے کی گئیں کہ ریاضی کی تعلیم خواتین کی ترقی کے لیے کس حد تک نئے چیلنجوں اور مواقع کی پیش کش کرتی ہے؟ کہ خواتین کو بااختیار بنانے کے تناظر میں ریاضی کی تعلیم، سیکھنے اور تشخیص میں بہت موزوں ہے۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ معاشرے کی ترقی میں ریاضی کا کردار کتنا اہم ہے۔ اسی لیے شائد 13 ویں صدی کے ایک عالم، فلسفی اور سائنس دان راجر بیکن (1214-1294) کے مطابق،" ریاضی کی ناسمجھی سارے علم کو نقصان پہنچا رہی ہے، کیوں کہ جو اس کو نہیں سمجھتا وہ دوسرے علوم یا دنیا کی چیزوں کو بھی نہیں جان سکتا ہے"۔

حوالہ جات:

1۔"Teaching of Mathematics" جیمز، اینیس (2010)، نیل کمال پبلیکیشن پرائیویٹ، لمیٹڈ، حیدرآباد۔

2۔قومی درسیات کا خاکہ (2005) این سی ای آر ٹی پبلیکیشن، نئی دہلی

3۔تدریسیات ریاضی، (2012) دوسالہ بی ایڈ کے لیے نصابی کتاب۔ این سی ای آر ٹی نئی دہلی،

4۔روحی فاطمہ: تدریسیات ریاضی (2022)؛ مکتبہ جامعہ کے ذریعے شائع

□□□

Dr. Roohi Fatima
Associate Prof.
Department of Teachers Training
Non-Formal Education,
Faculty of Education,
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

ڈاکٹر فرخندہ ضمیر

افسانوی ادب میں نثار راہی کا مقام

ملک کے معروف افسانہ نگار برادرم نثار راہی کو Ignore کیسے کیا جاسکتا ہے جب کہ ان کے افسانے پچھلے تقریباً پچیس سالوں سے ملک کے ادبی وعوامی رسائل میں تواتر سے شائع ہوکر عوام وخواص سے بہت پذیرائی حاصل کرچکے ہیں۔

جناب فراغ روہوی کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہونے والے سہ ماہی ''ترکش'' نے اپنے اکتوبر تا دسمبر 2004 کے شمارے میں نثار راہی پر گوشہ شائع کیا تھا جو مجھے کسی طرح حاصل ہوا۔ اس شمارے میں ملک کے معروف ناقد جناب علی احمد فاطمی کا ایک مضمون ''ہندوستان کا افسانہ نگار۔ نثار راہی'' اور دوسرا مضمون بھوپال کے مرحوم اختر سعید خاں صاحب کا بھی ہے، جو ''نثار راہی کے افسانے'' کے عنوان سے ہے۔ سنا ہے کہ مرحوم اختر سعید خاں ایڈوکیٹ اعلیٰ درجے کے شاعر اور دانشور تھے اور پچاس کی دہائی میں بھوپال میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کا جو سیمینار ہوا تھا اس کے روحِ رواں بھی تھے۔

اپنے مضمون میں علی احمد فاطمی نے نثار راہی کے کئی افسانوں (بھمنا، میاں خاندانی، نکٹی، رائفل، کالا آسمان، چٹان ریزہ ریزہ، کٹھ پُتلی کے دھاگے، بوڑھے مگر ارماں نہ ہوئے) پر بات کی ہے۔ کچھ کے تجزیے کیے ہیں تو کچھ کو اردو ادب کے اچھے افسانوں کے زمرے میں رکھا ہے۔ کچھ افسانوں کے اچھے جملوں کے انھوں نے حوالے بھی دیے ہیں۔ مضمون کے آخر میں انھوں نے لکھا کہ میں نثار راہی کو اردو کا نہیں ہندوستان کا افسانہ نگار مانتا ہوں۔

اختر سعید خاں نے آج کے اردو افسانے پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ پچیس تیس سال پہلے تک شعر اور افسانے میں سماجی حقیقتوں کی جو دھوم تھی وہ اب نہیں ہے جو افسانے اُن دنوں لکھے گئے ہیں ان کی افادیت اور سماجی حقیقت نگاری کا ذکر آج بھی ہے۔ اس کے برعکس نظریات کی تبدیلی کے بعد جو کچھ لکھا گیا وہ نہ خاص شہرت پاسکا اور نہ مقبول عام ہوسکا۔ پریم چند، کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت اور ان کے کئی معاصرین کے افسانے آج بھی صداقت کی لکیر بنے ہوئے ہیں اور ہمارے حافظے کا حصّہ بن گئے ہیں۔

مندرجہ بالا تحریر کے بعد اور آج کے افسانے پر بحث کرنے کے بعد انھوں نے جب افسانہ نگار نثار راہی پر لکھنا شروع کیا تو سب سے پہلے ان کا جملہ یہ تھا ''نثار راہی پریم چند اسکول کے افسانہ نگار ہیں''۔ آگے وہ لکھتے ہیں

کہ ان کی کہانیاں پڑھتے وقت ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کہانی کی مقصدیت کے متلاشی ہیں۔ مقصدیت خود بہ خود ان کی کہانی میں دَر آتی ہے۔

نثار راہی کو پریم چند اسکول کا کہہ کر اختر سعید خاں صاحب نے انھیں فکشن کی اونچی مسند پر بٹھا دیا ہے۔ جب ملک کے اردو ادب کے دو اہم لوگوں نے انھیں افسانوی ادب کی اونچی مسند پر بٹھایا تو ہمارے لیے یہ دیکھنا ضروری ہو گیا کہ انھیں کس بناء پر اونچی مسند پر بٹھایا گیا۔

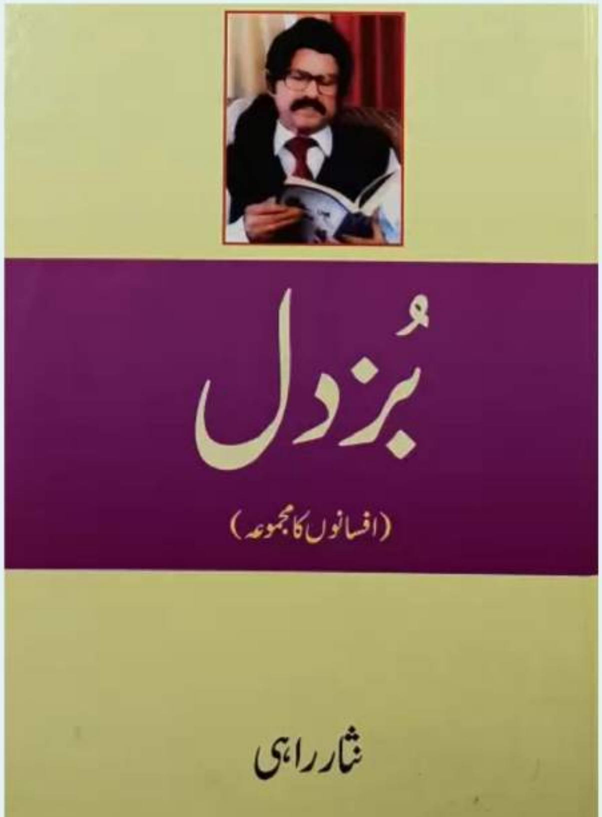

نثار راہی کے افسانوی ادب پر نقاد صاحبان کو تو چھوڑیئے، کیونکہ معتبر اور اعلیٰ درجے کے نقاد صاحبان اب کہاں ہیں۔ جو دہلی وغیرہ میں ہیں انھیں دور دراز پر بیٹھے ہوئے فنکار کو دیکھنے پرکھنے کی فرصت کہاں۔ آج تعلقات پر لکھا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ ادبی دنیا میں نثار راہی نے ادب کے لوگوں میں اپنا وسیع حلقہ نہیں بنایا۔ ایک بار کے علاوہ وہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے جا کر ملے تک نہیں۔ ان کا ادب علی احمد فاطمی تک پہنچ گیا اور بھوپال میں ان سے ملاقاتیں ہوئیں تو انھوں نے نثار راہی پر لکھ دیا اور لکھا تو ایک دم سچ لکھا۔ اختر سعید خاں اور فاطمی صاحب سے یہ اُمید کیسے کی جاسکتی ہے کہ انھوں نے مبالغے سے کام لیا ہوگا۔ یہ دونوں صاحبان بہت معتبر، معیاری اور ایماندار لوگ رہے ہیں۔

سوال پھر وہی کہ نثار راہی کو پریم چند اسکول کا کیوں کہا گیا؟ اب یہ ذمے داری ہماری ہے کہ ہم دیکھیں کہ انھیں پریم چند اسکول کا کیوں کہا گیا۔

سب سے پہلے تو میں یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ ان کے تحریر کردہ افسانوں کے ڈھیر میں بہترین اور معیاری افسانے کون سے ہیں۔ اُن افسانوں کی چھان پھٹک بعد میں کی جائے گی۔ جیسا کہ منٹو کے افسانوں میں سے دس بہترین افسانوں کا انتخاب کیا گیا، میں نے بھی نثار راہی کے دس بہترین افسانوں کی نشاندہی کی ہے:

(1) بھما (2) فنکار (3) مصیبت (4) کٹھ پتلی کے دھاگے (5) کالا آسمان (6) رائفل (7) کجری (8) بوڑھے مگر ارماں نہ ہوئے (9) گائے (10) لکشمی جی اور سرسوتی جی (11) گیارسی۔

مندرجہ بالا افسانوں کے علاوہ بھی جو افسانے عمدہ اور قابل تعریف ہیں ان میں چٹان ریزہ ریزہ، نکٹی، میاں خاندانی، شاطر کون؟، مفلوج، وہ درد بھری آنکھیں، ناگ، استحصال، جیل جانے کے بعد، دو بوڑھے، وہ شیر گدھا نہیں تھا، بڑے میاں دیوانے، پگلی کا سچ، سچا سُکھ، ڈھلان، جانوروں کی کانفرنس، جب پڑوسی میوزک سنتا ہے، اب آئی نرم پولیس، گوما ابھی نادان ہے، منٹو کا جادو وغیرہ۔

یہ افسانے ان کے 6 افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں جن کے نام ہیں رائفل، شیشۂ دل، چٹان ریزہ ریزہ، دوسری عورت، بزدل، منٹو کا جادو۔ ان کے پہلے مجموعے ''سنہری پت جھڑ'' کا ذکر میں نے اس لیے نہیں کیا کہ وہ ان کے بہت شروع کے افسانے ہیں، جن کو قابل ذکر نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے یہ سارے مجموعے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی نے شائع کیے ہیں۔ میں نے بیشتر وہیں سے دستیاب کیے ہیں۔

اب آپ کہیں گے کہ یہ بتائیے کہ ان کے افسانوں میں کیا خاص بات ہے جو انھیں مندرجہ بالا دو اصحاب نے تخلیقی ادب کی اونچی مسند پر بٹھایا ہے۔

اس سلسلے میں کہوں گی کہ نثار راہی نے اردو ادب کے درجہ اوّل کے مشہور افسانہ نگاروں کی وِراثت کو آگے بڑھایا ہے اور یہ کہنا بھی ٹھیک ہوگا کہ راہی کے افسانوں کو ان کے افسانوں کے برابر رکھا جاسکتا ہے۔ ان کی فنکاری بڑے افسانے کے ضروری لوازمات کو بھی فراہم کرتی ہے۔ جیسے کہ ان کا طرزِ تحریر، کہانی کا پلاٹ، موضوعات کا تنوع، کہانی کی بُنت، کردار نگاری، مکالمے اور حقیقت پسندی۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، آپ خود ان کے متذکرہ افسانوں کو پڑھ کر دیکھ لیں۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن مجھے نہیں آتا۔ جیسا کہ رواج ہے، کسی فکشن رائٹر پر لکھتے وقت اس کے چند

افسانوں کے پلاٹ، منظرنگاری، مکالموں کے جملے اور طرزِ تحریر وغیرہ پر بات کی جاتی ہے، اس سے قاری کو فنکار کے فن کا کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ اِس طرح کے رائج رواج کو میں بھی درگزر نہیں کرسکتی۔ کچھ افسانوں کا حوالہ ضروردوں گی جو مجھے بہت پسند ہیں۔

فنکار: یہ ایک ایسے بزرگ افسانہ نگار کی کہانی ہے جو بہت مشہور و معروف ہے، رسائل میں تواتر سے چھپتے رہے اور اپنے طبع شدہ افسانوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ لیکن جب انھیں ہارٹ اٹیک ہوا اور اس سے جب وہ جانبر ہوئے تو انھیں نہ صرف ڈاکٹروں نے بلکہ گھر والوں نے بھی لکھنے پڑھنے سے سختی سے منع کر دیا۔ اب وہی بات کہ جب مرغی انڈا دینا چاہتی ہے تو وہ مناسب جگہ ڈھونڈتی ہے۔ بالکل اسی طرح وہ بھی چوری چھپے لکھنے لگے اور جب گھر والوں کو اس چوری کا علم ہوا تو وبال آ گیا۔ ان پر سب ٹوٹ پڑے۔ آخر میں انھوں نے کہہ دیا کہ میں مرسکتا ہوں لیکن اپنے ادب کو تحریر کرنے سے باز نہیں آ سکتا۔ یہ افسانہ فن کی بلندیوں پر ہے اور اسے کرشن چندر، بیدی وغیرہ پرانے استادوں کی تخلیقات کے مقابلے کسی بھی سطح پر کمتر نہیں کہا جاسکتا۔ آپ افسانے کو پڑھیں گے تو دیکھیں گے کہ اسے کوئی پرانے استاد ہی نے لکھا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھوپال کی ساہتیہ اکیڈمی کے سابق ڈائریکٹر نے اس افسانے کو بہت پسند کیا اور نثار راہی کو انھوں نے بھی پریم چند اسکول کا فنکار مانا۔ اب یہ تیسری ہستی ہے جس نے نثار راہی کو پریم چند اسکول کا فنکار مانا ہے۔ لہٰذا نثار راہی کے افسانوں کی تحقیق کیا جانا بہت ضروری ہے اور انھیں ان کا صحیح مقام دیا جانا ضروری ہے۔

بھما: دیہات کے ایک ایسے لڑکے کی کہانی ہے جو ذہنی طور پر جنم سے ہی ادھورا ہے۔ اس کے ساتھی لڑکے اس کا مذاق اُڑاتے رہتے ہیں۔ بھما کی زبان اور ساتھیوں کے مذاق اُڑانے کا بیان بہت ہی خوبی سے تحریر کیا گیا ہے۔ پھر پلاٹ بھی بہت خوب ہے۔ اس کے باپ کا یہ ایک ہی لڑکا ہے جس کو فکر یہ ہے کہ اس کی دماغی حالت کو دیکھتے ہوئے کون ہوگا جو اپنی لڑکی اسے دے گا اور یہ بھی کہ وہ ازدواجی زندگی کی اندرونی ضروریات کو سمجھتا بھی ہے یا نہیں۔ لہٰذا اُس پر یہ فکر طاری رہی کہ بھما کی شادی اگر نہ ہوئی تو اس کا ونش آگے کیسے بڑھے گا۔ بہرحال، اس پر ریپ کا الزام لگ جاتا ہے اور وہ گرفتار ہو جاتا ہے تو باپ رنجیدہ ہونے کے بجائے خوش ہوتا ہے کہ اس طرح یہ ثابت ہوگا کہ وہ ازدواجی زندگی کے اندرونی معاملات سے واقف ہے۔ اسے بھروسہ ہے کہ لڑکی کے خلاف بولنے کے باوجود ہوشیار وکلاء صاحبان اسے کیس سے بری کروادیں گے۔ لیکن عدالت میں معاملہ کچھ اور ہی ہوتا ہے جو کہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کہانی دیہات کی ہے اور دیہات والوں کی بولی کو بڑی مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ ''فنکار'' اور ''کجری'' کے بعد ان کے فن کی چابکدستی کی ایک اور مثال ہے۔ اس افسانے کو نثار راہی کا نمائندہ افسانہ کہا جاسکتا ہے۔ علی احمد فاطمی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس افسانہ کو اردو کے اچھے افسانوں میں شامل کیا ہے۔ ان کا یہ طویل مضمون ماہنامہ ''شاعر'' میں برسوں پہلے شائع ہوا تھا۔ میں فی الحال اشاعت کا سال اور مہینہ بتانے سے قاصر ہوں۔

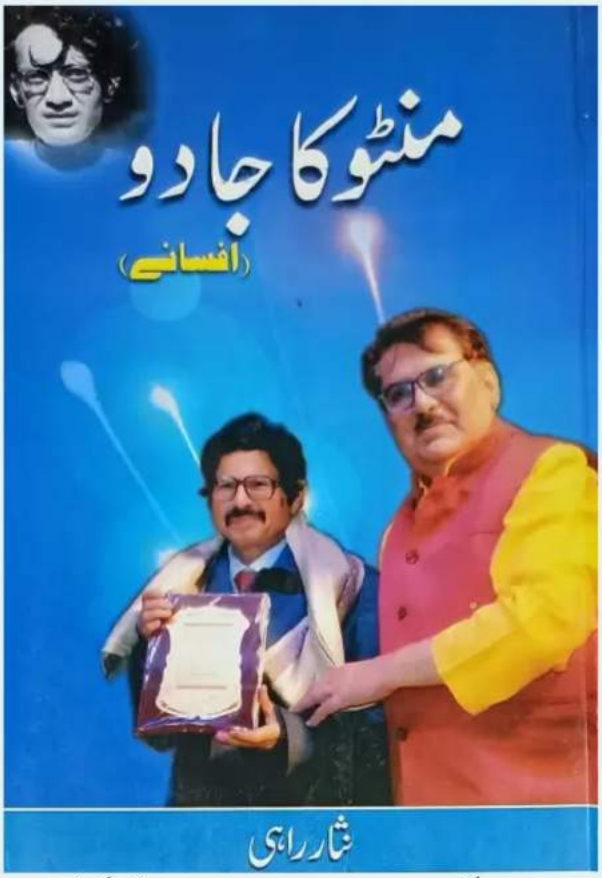

پرہیز حکیم صاحب کا: اس افسانے میں ایک بزرگ حکیم کی کردار نگاری بڑی خوش اسلوبی سے بیان کی گئی ہے۔ پورا افسانہ طنز و مزاح کی چاشنی میں ہے اور اسے پڑھتے ہوئے لطف حاصل ہوتا ہے۔ حکیم صاحب اپنے مریضوں پر پرہیز کرنے کا اس قدر زور دیتے ہیں کہ وہ ان کا مراق معلوم ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ یونانی علاج کے نقطۂ نگاہ سے ان کا پرہیز کرنے کے لیے سختی کرنا عین مناسب ہے لیکن حکیم صاحب کی ڈانٹ پھٹکار ان کا نارمل عمل نہیں ہے۔ وہ اپنے مریض کی بدپرہیزی جان کر ان کا علاج بند کرنے کی دھمکیاں دیتے ہیں جس سے ہر مریض پریشان ہے۔

افسانے میں بذلہ سنجی بھرپور ہے اور مکالمے بھی خوب ہیں۔ حکیم صاحب اپنے ہر ایک مریض کو گوشت نہ کھانے کی تنبیہہ کرکے اس کے نقصانات بتاتے ہیں لیکن افسانے کے اختتام میں وہ خود گوشت والے کی دکان پر جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قیمے میں کلیجی گردے بھی ضرور ڈال دینا۔ یہ کلائمکس غیر متوقع اور بیحد جاندار ہے۔ اسے آپ راہی کے دیگر افسانوں کے ساتھ ضرور پڑھیئے۔ یہ افسانہ ان کے تازہ مجموعے ''منٹو کا جادو'' میں شامل ہے۔

استحصال:۔ اس کہانی کا پلاٹ بھی خوب ہے۔ حقائق سے بھرپور۔ وکیل اپنے مؤکل کا استحصال کرتا ہے اور جب اس کے دماغ کا توازن بگڑتا ہے تو اسے چینئی کے نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس لے جایا جاتا ہے۔ اب باری ہے ڈاکٹر کی، جو وکیل کا استحصال کرتا ہے اور اس سے رقم کھینچتا ہے اور امیر ہوتا جاتا ہے۔ اب یہاں بھی کلائمکس کی خوبی دیکھئے۔ وکیل مریض کے بار بار دور دراز کا سفر کرکے آنے کی شکایت سن کر ڈاکٹر تنگ آ جاتا ہے اور وکیل کو سچائی سے یہ بتا دیتا ہے کہ وہ دراصل نفسیاتی مریض ہے ہی نہیں۔ یہاں پروفیشن کے استحصال کا راز افشاں کر دیا گیا۔ یہ افسانہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

گیارسی: پھر وہی دیہات۔ ان کے دیہات پر کئی افسانے دیکھ کر لگتا ہے کہ کیا نثار راہی پریم چند بننا چاہتے ہیں یا پریم چند کی روح ان کے جسم میں حلول کر گئی ہے۔ لیکن جیسا کہ علی احمد صاحب نے اپنے افسانے میں لکھا ہے کہ نثار راہی بھلے ہی شہر میں رہتے ہوں لیکن ان کی روح گاؤں میں بستی ہے، یہ بات صحیح لگتی ہے۔ دیگر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ نثار راہی کا ننیہال دیہات میں ہے اور وہ وہاں کئی کئی روز ٹھہر کر نہ صرف ذہنی سکون حاصل کرتے ہیں بلکہ دیہات کے سماج کو بھی انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے تو بار بار ان کا دیہات پر لکھنا قدرتی ہے۔

افسانہ گیارسی میں مرکزی کردار سردار (جو کہ دیہات میں رہتا ہے) نہ صرف شرابی ہے بلکہ اپنی بیوی گیارسی کی آئے دن مار پیٹ بھی کرتا رہتا ہے۔ اس کی مار پیٹ سے تنگ آ کر ایک روز وہ گھر چھوڑ دیتی ہے اور اپنے دو بچوں کے ساتھ کسی نامعلوم مقام پر چلی جاتی ہے۔ اب شروع ہوتا ہے بیوی کی جدائی سے سردار کو ہونے والی ذہنی اور جسمانی تکلیف کا دور۔ وہ روزانہ بستر سے اُٹھتا ہے اور منہ اندھیرے بیوی کو ڈھونڈنے نکل جاتا ہے۔ مگر بیوی ہے کہ اُسے ملتی ہی نہیں اور نہ کوئی سراغ ملتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی زندگی سے عاجز آ جاتا ہے۔ بہرحال کلائمکس آتا ہے اور وہ ڈرامائی انداز میں اپنی بیوی کو دیکھ لیتا ہے۔ دیکھنے کے بعد بھی اُسے پانا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ وہ ایک دوسرے گاؤں کے بڑے ہی خطرناک آدمی کے گھر میں تھی اور شوہر کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھی۔ مجھے راہی صاحب کی یہ کہانی بھی بہت پسند آئی۔ یہ افسانہ ان کے مجموعے ''دوسری عورت'' میں شامل ہے۔

مصیبت: جی ہاں، پھر گاؤں۔ افسانہ نگاروں نے تو عموماً اپنے افسانوں میں گاؤں کو تو چھوڑ دیا اور وہ پریم چند کی راہ پر چل ہی نہیں پا رہے لیکن نثار راہی دیہات پر بار بار لکھ کر پریم چند کی راہ پر چلتے نظر آتے ہیں۔

گاؤں میں ایک بڑے کاشتکار بھنور جی کے کھیت کو گاؤں کا کوئی آدمی بار بار اپنے جانوروں سے چرواتا رہتا ہے جس سے بھنور جی پریشان ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ حرکت گاؤں کے گوجروں کی ہے۔ اپنے ہریجن (دلت) کارندے مصری لال عرف مصریا کو پاس کے قصبے احمد پور کے پولیس تھانے پر جا کر فصل کی چوری کی رپورٹ لکھانے کی ہدایت کرتا ہے۔ مصریا اور اس کی پتنی کی رنجش کسی جھگڑے پر گاؤں کے ایک گوجر امر سنگھ سے تھی اس لیے وہ تھانہ جا کر گوجر امر سنگھ کے خلاف کھیت کی فصل کی اپنی بھینسوں سے چروا دینے یعنی چوری کی رپورٹ لکھا دیتا ہے۔ اب کام شروع ہوتا ہے پولیس کا اور اس کی تفتیش کا۔ گوجر امر سنگھ کو کئی بار تھانے بلایا جاتا ہے جو اپنی بے گناہی کی دُہائی دیتا ہے۔ تھانیدار سینگر سمجھ لیتا ہے کہ امر سنگھ بے قصور ہے، اسے مصریا نے خواہ مخواہ پھنسا دیا ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ کیوں نہ اُسے بلّی مرڈر کیس میں ملزم جگن کے خلاف گواہ بنا دیا جائے اور اس کیس میں چھوڑ دیا جائے۔ امر سنگھ راضی ہو جاتا ہے مگر رات میں اس کی بیوی اس سے کہتی ہے کہ اگر اس نے جگن کے خلاف گواہی دی تو اس کا بھائی کلہاڑی کے ایک ہی وار میں اسے ختم کر دے گا۔ امر سنگھ دوڑا دوڑا تھانے گیا، اپنی پگڑی تھانے دار کے پیروں میں رکھ کر بولا کہ وہ جگن کے خلاف مرڈر کیس میں گواہی دینے کو تیار نہیں ہے کیونکہ اگر اس نے گواہی دی تو جگن کا بھائی اسے مار ڈالے گا۔ بالآخر تھانے دار اسے مرڈر کیس میں گواہ نہ بنا کر بھنور جی کی فصل کی چوری کے کیس میں جیل بھجوا دیتا ہے۔

یہ افسانہ پولیس کی کارکردگی اور نظام پر چوٹ ہے کہ کس طرح معصوم دیہاتیوں پر ظلم کیا جاتا ہے اور کوئی بھی ان کی مدد نہیں کرتا۔ افسانہ دلچسپ ہے جسے قاری آخر تک پڑھے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔ اس افسانے کی تعریف علی احمد صاحب نے بھی کی تھی۔ بلاشبہ یہ اچھا افسانہ ہے۔

لکشمی جی اور سرسوتی جی:۔ اس افسانے میں بھی نثار راہی کی فنی چابکدستی بول رہی ہے۔ اس کو پڑھ کر بھی واہ کہنے کو دل چاہتا ہے۔ اس میں کمال کے مکالمے ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار کہانی کار ہے جس کی ایک

دکان بھی ہے۔ جب دکان سے آمدنی کم ہوتی ہے تو بیوی اس کے لکھنے سے ناراض رہتی ہے۔ اس کی پھوپھی جبلپور سے آتی ہیں اور گھر کی آمدنی کم دیکھتی ہیں تو بہو کی شکایت پر وہ کہتی ہیں کہ جہاں سرسوتی جی آتی ہیں وہاں سے لکشمی جی چلی جاتی ہیں۔ اس پوائنٹ پر کہانی میں اچھی بحث ہے۔

کجری:۔ سنا ہے کہ راہی صاحب کی اس کہانی پر ممبئی کا کوئی پروڈیوسر بغیر اجازت سیریل یا ٹیلی فلم (کہانی میں پھیر بدل کرکے) بنا رہا ہے۔ تو دیکھیں کجری کی کہانی کیا ہے۔

پھر وہی پریم چند جی کا ماحول یعنی دیہات۔ کجری جوالا پرشاد کی بہو ہے اور اسے گاؤں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ جوالا پرشاد کا بیٹا بنسی لال بگڑیل قسم کا بیٹا تھا جو اپنے بگڑے ہوئے دوستوں کے ساتھ دوسرے گاؤں جا کر شراب پیتا تھا۔ وہ ندی کے گہرے پانی میں نہاتے ہوئے ڈوب کر مر گیا۔ کجری بیوہ ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد اس کا سُسر اس پر نظر رکھنے لگا اور چاہتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کردے۔ مگر کجری بچتی رہی۔ وہ ہفتے کے دن کہ جب پاس کے گاؤں میں ہاٹ لگتی تھی تو سُسر کے ایک کارندے گبرو کے ساتھ آٹا پسانے اور گھر کی ضرورت کا سامان لینے بیل گاڑی میں چلی جاتی تھی۔ اسی درمیان وہ گبرو کو چاہنے لگی۔ جوالا پرشاد نے ایک رات اس سے کہا کہ وہ گبرو سے اس کا بیاہ کردے گا۔ مگر دل میں اس کا پلان کچھ اور ہی تھا۔ کجری نے دیکھ لیا کہ اس کی آنکھوں میں خراب ارادے ہیں۔ اس نے عہد کیا کہ وہ صحیح موقع پر بڈھے کو ٹھکانے لگائے گی۔ خراب آدمی کو عزت دار عورت ناگن کی نظر سے دیکھے ہے اور صحیح موقع پر اور سمے پر اسے ڈسے ہے۔

کہانی کا بیان بڑا دلکش ہے۔ گاؤں کا ماحول بھی پیارا ہے اور کردار نگاری کا تو جواب ہی نہیں۔ بتایا گیا ہے کہ یہ کہانی ماہنامہ آج کل میں چھپی تھی اور بہت سراہی گئی تھی۔ وثوق سے کہہ نہیں سکتی لیکن خیال ضرور آتا ہے کہ کیا نثار راہی نے دیہات کے ماحول میں اس کہانی کو منشی پریم چند سے بھی بہتر انداز میں لکھا ہے۔ آپ طے کیجیے۔

اس سے زیادہ کہانیوں پر لکھوں گی تو مضمون کی طوالت بڑھ جائے گی۔ ہاں ایک بات کا ذکر اور کروں گی۔ نثار راہی کی ایک کہانی ہے باپ کی رکھیل۔ باپ کی رکھیل کے موضوع پر موپاساں نے بھی ایک کہانی لکھی ہے۔ (مترجم رفیق شاہین صاحب نے کہانی کا انگریزی نام نہیں دیا۔ وہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گی۔ اردو ترجمہ میرے پاس ہے) اس کو پڑھ کر میرا جی چاہا کہ دونوں کا مقابلہ کیا جائے۔ اس موضوع پر دونوں کہانیوں کے پلاٹ بڑے اچھے ہیں۔ دونوں کہانیوں میں کشش ہے۔ دیگر باتیں تو چھوڑیئے، نثار راہی کا موپاساں سے مقابلہ کرنا ہی بڑی بات ہے۔ میرے خیال میں باپ کی رکھیل کے موضوع پر دونوں نے ہی بازی ماری ہے۔

بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ واقعی نثار راہی نے افسانے کے پرانے استادوں یعنی کرشن، بیدی اور منٹو کی وراثت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان لوگوں کے افسانوں سے نثار راہی کے بیشتر افسانے کسی طور پر بھی کم نہیں۔ ان کی کہانیوں کی طرزِ تحریر میں دلکشی ہے اور بہاؤ ہے اور موضوعات میں تنوع ہے۔ اور زندگی کا گہرا مشاہدہ نظر آتا ہے۔ مکالمے اور کردار نگاری بھی لاجواب ہیں۔ ان کے کئی افسانے نفسیات اور جذبات پر مبنی ہیں آخر ملک کے مؤقر رسائل آجکل شاعر، شمع، بیسویں صدی وغیرہ نے انھیں چھاپا ہے تو کہانیوں کا معیار دیکھ کر ہی چھاپا ہے۔ ہر طرح کے قارئین نے کہانیوں کی بہت پذیرائی کی ہے، لیکن ناقدین اور محققین صاحبان نے ان کے کام کو پرکھا ہی نہیں۔ بے شمار خطوط جو نثار راہی کی کہانیوں کی اشاعت پر ان کو ملے ہیں وہ بھی کہانیوں کے اعلیٰ درجے کا ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ بہرحال افسانوی ادب میں ان کا قد یقیناً اونچا ہے۔

□□□

Dr. Farkhanda Zameer
"Arbab Mansion"
H.No. 805/11, Street No. 3,
Azad Nagar, Khanpura,
Ajmer-305001 (Rajasthan)
Cell. 9414277690

فوزیہ حبیب

اکبر زاہد کے افسانوں میں انشاء پردازی

جب خیالات کوتحریری شکل دینے کے لیے قرطاس وقلم کا سہارالیا گیا تو پھر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ جس طرح ایک شعلہ بیان مقرر اپنی تقریر کوخوبصورت اور بامعنی الفاظ اورآواز کے زیرو بم سے اپنے خیالات اورتاثرات کا اظہار کرتے ہوئے سامعین کا دل موہ لیتا ہے،اسی طرح تحریر میں اور خاص کر نثر میں بھی وہی کمال پیدا کردیا جائے تو وہ انشاء پردازی کہلائے گی۔نثر میں نثر نگار سامنے تونہیں ہوتا اور نہ ہی وہ آواز کے زیرو بم سے کچھ تاثر دے سکتا ہے کیونکہ وہ موجودنہیں ہوتا،لیکن اس کے باوجود ایک نثر نگار کے لیے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی تحریر کے ذریعے قاری کوغم، خوشی، حیرت، خوشبو، محبت اور نفرت کے جذبات سے معمور کرے۔ہر مصنف کی یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنی انشاء پردازی کے ذریعے قاری تک اپنی بات مؤثر طریقے سے لے جائے۔

جذبات کے بغیرانسانوں کی زندگی ہوہی نہیں سکتی۔خوشی،غم،آہ و فغاں، دکھ سکھ یہ سب انسانی زندگی کے ساتھ ہے۔جذبات سے ہی اس کی زندگی میں رعنائی ہوتی ہے۔جذبات نہ ہوں تو انسان محض پتھر کی ایک بے جان مورت کی طرح ہے۔انشاء پردازی سے جذبات مشتعل بھی ہوسکتے ہیں،اورانھیں ٹھنڈی آنچ بھی پہنچائی جاسکتی ہے۔

وہ چاہے اردو زبان ہو یا کوئی اور زبان، انشاء پردازی کے بغیر ادب مکمل نہیں ہوسکتا۔انشاء پردازی ادب کا ایک اہم ترین حصہ ہوتا ہے اوراردوادب اس اعتبار سے کافی وسعت رکھتا ہے کہ اس میں انشاء پردازی فطری طور پرموجود ہے۔اردو زبان کے ناول نگار اور افسانہ نگاروں نے لاشعوری طور پرانشاء پردازی میں کمال حاصل کرلیا ہے۔

انشاء پردازی کی ایک اورتعریف یہ ہے کہ وہ ادب اور تاریخ کے بے جان اوراق میں شعور اور احساس کی روح کو پھونک دیتا ہے اور قاری ان احساسات کا ادارک کرنے لگتا ہے جسے لکھنے والا ان تک پہنچانا چاہتا ہے۔ادبی چاشنی اورفنون لطیفہ کی ٹھوس بنیادوں پر لکھی جانے والی تحریر کو جب مربوط کیا جاتا ہےتو وہ انشاء پردازی کے قالب میں ڈھل جاتی ہے۔

یہاں ہم شہر وانمباڑی سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار، شاعراور صحافی اکبرزاہد کے افسانوں میں انشاء پردازی پر گفتگو کریں گے۔

اکبرزاہد کا اصل نام اکبر بادشاہ ہے ان کی پیدائش 1952 میں وانمباڑی میں ہوئی۔بی کام کرنے کے بعد انھوں نے تجارت کا پیشہ اپنایا 1968 میں پہلا افسانہ ”تخلیق“ لے کرادبی دنیا میں قدم رکھا تھا اکبرزاہد کے مختصرافسانے آج کی نئی سوچ کے آئینہ دار ہیں ان کے افسانے ”فن کار“، حیدرآباد“،”تیز گام“ دہلی،”اور سالار“ بنگلور میں شائع ہوچکے ہیں۔

اکبرزاہد کے افسانوں کا ایک مجموعہ ”ایک نیزہ اونچا آسمان“ کے نام سے 1997 میں منظرِ عام پرآیا۔اس کے بعد بھی ان کے کئی افسانے ملک کے مقتدر رسالوں اوراخبارات میں شائع ہوئے۔اس کے علاوہ اکبر زاہد کی شاعری کا ایک مجموعہ ”مٹھی بھر سورج“ کے نام سے شائع ہوکر مقبولِ عام ہوچکا ہے۔ان دو کتابوں کے علاوہ اکبرزاہد کی تصنیف کردہ کتابیں ”عکسِ وانمباڑی“؛”نقوشِ اسلاف“؛”گفت وشنید“؛”تاریخ دارالعلوم عمرآباد“؛اور گلدستہ مفید عام“ بھی شائع ہوچکی ہیں۔ان کتابوں کے علاوہ اکبرزاہد نے بحیثیت صحافی روزنامہ سیاست، روزنامہ راشٹریہ سہارا، دعوت، امنگ، عالمی سہارا وغیرہ میں اپنے متعدد کالم اوراہم موضوعات پر سینکڑوں مضامین کے ذریعے اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ان کے مضامین میں بھی انشاء پردازی موجود ہے جس پر ریسرچ اسکالرس ایک الگ

موضوع کی حیثیت سے جائزہ لے سکتے ہیں۔ تاہم یہاں ہم صرف اکبر زاہد کے افسانوں کا مجموعہ ''ایک نیزہ اونچا آسمان'' کے چار منتخب افسانوں میں اکبر زاہد کی انشاء پردازی کا جائزہ لیں گے۔

ایک نیزہ اونچا آسمان کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس افسانوی مجموعہ کو انٹرنیٹ کے مقبول عام ویب سائیٹ ''ریختہ'' میں جگہ دی گئی ہے اور اسے ''ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد'' نے ریختہ کو عطا کیا ہے۔

جہاں تک اکبر زاہد کے افسانوں کی بات ہے ان کے ہر افسانے میں انشاء پردازی کے عناصر موجود ہیں۔ جس روانی سے وہ افسانے لکھتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انشاء پردازی ان کے اندر فطری طور پر موجود ہے اور جو کچھ بھی وہ کہنا چاہتے ہیں، قاری اس کا ادارک کر لیتا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعہ کا پہلا افسانہ ''چھت'' کے نام سے ہے۔ اس افسانے سے کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''گھر سے باہر نکل کر اس نے سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ نیلگوں آسمان اپنا رنگ کھو رہا تھا۔ سیاہ بادلوں کا ایک غول سا اُسے اپنی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ اُس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ پھر وہ تیز تیز چلتا ہوا گلی سے نکل کر کھلی سڑک پر آ گیا۔ کھلی سڑک پر پٹرول اور ڈیزل کی ملی جلی بُو نے اس پر حملہ کیا۔ اُسے ہمیشہ سے یہ بُو بڑی اچھی لگتی تھی۔ گلی میں کسی بد روح کی طرح منڈلاتی ہوئی گٹر کی بدبو سے پیچھا چھڑا کر جب بھی وہ کھلی سڑک پر آتا تو اسے ایسا لگتا جیسے اس نے اپنی سانسوں کو غسل دے دیا ہو۔ اس کو گٹر میں کلبلاتے ننھے منے کیڑے اور جراثیم تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دکھائی دیتے اور وہ جلدی جلدی کھلی سڑک کی اس تیز اور چبھتی ہوئی مہک کو اپنی سانسوں میں گھولنے کی کوشش کرتا۔''

ان جملوں میں افسانہ نگار نے ایک پوری کہانی بیان کر دی ہے۔ بدبودار گلی کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ گلی گٹر سے متصل ہے اور اسی گلی میں کہانی کے ہیرو کا گھر یا جھونپڑی ہے۔ گٹر میں کلبلاتے کیڑے اور جراثیم ہیں۔ اسی بدبودار گلی میں اسے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے اور جب وہ گلی سے باہر نکل کر آتا ہے تو وہاں سڑکوں پر بسوں، کاروں اور ٹیکسیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں سے پٹرول اور ڈیزل کی بو اسے بہت اچھی لگتی ہے اور اسے لگتا ہے کہ اس نے اپنی سانسوں کو غسل دے کر اس بدبو سے نجات حاصل کر لی ہو۔ اس لیے وہ باہر سڑک پر آتے ہی گہری گہری سانسیں لے کر پٹرول کی بو کو اپنے اندر سما لینے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے بعد آگے چل کر افسانہ نگار نے انسان کے اندر آزادی کی جوخُو ہے اسے یوں بتایا ہے:

''آج وہ آزاد تھا۔ اس نے آنکھیں گھما گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب چیزیں ایک دم نئی لگ رہی تھی۔ سڑک پر دوڑتی ہوئی گاڑیاں، راہگیر، دکانیں حتیٰ کہ سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے بجلی کے کھمبے بھی نئے لگ رہے تھے۔ آزادی کا احساس بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ وہی چیزیں جو، اب سے چند گھنٹوں پہلے تک پرانی اور بوسیدہ تھیں، اب نئی اور چمکدار لگنے لگی تھیں۔ سچ ہے انسانی فطرت قید برداشت نہیں کر سکتی۔''

اکبر زاہد کی انشاء پردازی کی ایک اور مثال اسی افسانہ چھت کے اس پیراگراف میں ملاحظہ فرمائیں جس میں انھوں نے آج کی تیز رفتار زندگی کا مختصر خاکہ محض چند لائنوں میں کھینچ دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''باہر سڑک پر زندگی رواں دواں تھی۔ لوگ تیزی سے آ جا رہے تھے۔ ہر کسی کو جلدی تھی جیسے کوئی ان کا تعاقب کر رہا ہو یا وہ کسی کے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ وہ ان لوگوں کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر میں جو جھگڑا ہوا تھا، اسے وہ قطعی بھول چکا تھا۔ باہر کی چہل پہل اور زندگی کی روانی نے اسے تھوڑی دیر کے لیے مسحور کر دیا تھا۔ وہ بھول گیا کہ وہ کس لیے اپنے گھر سے باہر آیا ہے۔ اسے ان لوگوں پر حیرت تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ان لوگوں کو اتنی جلدی کیوں ہے۔ یہ لوگ کس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ اس نے دور تک نظریں دوڑائیں۔ لیکن اسے سڑک پر چمچماتی کاروں، عظیم الشان عمارتوں، خوبصورت ہوٹلوں اور ملبوسات کی دکانوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ سڑک بالکل سیدھی چلی گئی تھی۔ اس نے وہیں کھڑے ہو کر سڑک کی آخری حد کو دیکھنے کی کوشش کی، سڑک آخر میں آسمان سے جا کر مل گئی تھی۔ ارے! کیا یہ سڑک آسمان کو جاتی ہے؟ وہ تعجب سے سوچنے لگا۔ پھر اپنے احمقانہ خیال پر اسے خود ہنسی آ گئی۔ وہ زیرِ لب مسکرانے لگا اور وہاں سے چل پڑا۔''

اکبر زاہد کا ایک اور افسانہ ''ایک نیزہ اونچا آسمان'' ہے جس میں انشاء پردازی کی کئی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:

''کوئی کسی سے یہ نہیں کہتا کہ تم کہتے چلے جاؤ اور میں سنتا چلا

جاؤں، بلکہ ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ میں بولوں گا، تم سنو گے، شاید اسی لیے یہ دنیا ''میں'' کے گرد گھومتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ساری دنیا ''میں'' کے سحر میں گرفتار ہو۔''

اکبر زاہد نے مذکورہ بالا جملوں سے انسان کے اندر ''انانیت'' کا جو مادہ موجود ہے اس کی طرف نشاندہی کی ہے۔ ہم اپنی زندگی میں اس کا مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ ہر آدمی ''میں'' کے سحر میں گرفتار ہے اور یقیناً موجودہ دور ''میں'' کا دور ہے۔ خلوص، محبت، اور خدمت کا جذبہ عنقا ہے۔

پھر یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں کہ:

''دونوں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ فضا میں باہم ٹکرائے۔ گھمسان کا رَن پڑا، نہ جانے کتنے حسین الفاظ زخمی ہوئے اور نہ جانے کتنے قد آور جملے شہید ہوئے۔ پھر جب دونوں طرف سے بھڑاس کچھ کم ہوئی اور تھکن کا احساس غالب ہونے لگا تو وہ پھر خاموش ہو گئے۔''

اس میں اکبر زاہد نے الفاظ کی فضا میں باہم ٹکرانا اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں حسین اور خوبصورت الفاظ کا زخمی ہوجانا اور کئی قد آور جملوں کا شہید ہوجانا وغیرہ استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے اس چھوٹے سے پیراگراف کے اندر انھوں نے غور وفکر کے لیے ایک وسیع میدان فراہم کردیا ہے۔ ہم اکثر اپنی زندگی میں اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کس طرح ایک اعلیٰ نظر آنے والا انسان بھی جب انانیت کا شکار ہوجاتا ہے تو چند ہی ساعتوں میں وہ اپنا اخلاق کھو بیٹھتا ہے۔ غصہ کی حالت میں انسان کی زبان سے شائستہ الفاظ کی جگہ غیر شائستہ الفاظ نکلنے لگتے ہیں جسے اکبر زاہد نے خوبصورت الفاظ کا زخمی ہوجانا کہا ہے اور بڑی بڑی قد آور شخصیتیں بھی بسا اوقات اپنا وقار کھو بیٹھتی ہیں جسے اکبر زاہد نے قد آور جملوں کی شہادت سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں لفظ شہید پر غور فرمائیں اور لطف لیں کہ کس طرح اکبر زاہد نے اپنی انشاء پردازی کے ذریعے انتہائی خوبصورت الفاظ میں ایک تلخ حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔

پھر یہ پیراگراف بھی ملاحظہ کرلیں۔ یہاں افسانہ نگار نے خاموشی کو ایک لاش سے تعبیر کیا ہے، لیکن اس خاموشی کو لاشے کو لے کر کہانی کے کردار ایک خوبصورت گاؤں پہنچتے ہیں تو وہاں کی خوبصورتی اور خوش حالی کو دیکھ کر ان کے چہرے ایک انجانی مسرت سے سرشار ہوجاتے ہیں۔ یہ الفاظ کی جادوگری ہے کہ قاری بھی اپنے آپ کو اسی ماحول میں پاتا ہے:

''خاموشی کے لاشے کو لیے وہ کئی میل چلتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہ ایک خوب صورت سا گاؤں تھا۔ فطرت اپنے جلوے اس گاؤں میں لٹا رہی تھی۔ چاروں طرف حسین چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، خوب صورت جھرنے، ہری بھری کھیتیاں، پھلوں کے باغات، دودھ دینے والے پالتو جانوروں کی بھرمار، چہچہاتی ہوئی چڑیاں، نغمے بکھیرتی ہوئی وادیاں، گیت گاتے ہوئے بادل، گاؤں پر سایہ فگن نیلا آسمان اور اس میں چمکتا ہوا سورج جو جسموں کو حدّت پہنچا رہا تھا۔ کیا کچھ نہیں تھا اس گاؤں میں۔ وہ دونوں فطرت کے ان مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے پھٹی ہوئی تھیں۔ ایسی خوش حالی اور ایسے خزانے انھوں نے کہاں دیکھے تھے۔ ان کے چہروں سے ایک انجانی مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔''

ایک طرف تو خوبصورت باغات، سرسبزی وشادابی لیکن دوسری طرف ویرانی جس کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے:

''چلتے چلتے انھوں نے کئی منزلیں طے کرلیں۔ جھاڑیوں سے پتے خشک ہوکر گرنے لگے، پھر ان میں ہریالی آئی، برساتیں ہوئیں، سخت دھوپ نے ان کے پاؤں میں چھالے ڈال دئے اور کئی موسم یوں ہی بیت گئے۔ جب انھیں اس طرح چلتے ہوئے کئی قرن بیت گئے تو ایک دن انھوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی بستی میں پایا جو بالکل ویران اور اجاڑ تھی، درخت سوکھ چکے تھے اور ندیاں خشک نظر آرہی تھیں۔ زمین میں شگاف پیدا ہورہے تھے، سورج قہر برسا رہا تھا، درختوں کی سوکھی ٹہنیاں مسافروں کو سایہ دینے میں ناکام ہوچکی تھیں۔ کھیتیاں برباد اور اناج ناپید تھا۔ پالتو جانوروں کے تھن سوکھ کر ان کے جسموں سے لگ چکے تھے۔''

اور پھر اس کے بعد موت کا ذکر جسے اکبر زاہد نے ان جملوں میں بیان کیا ہے کہ دل تھرا جاتا ہے:

''ایک دن ہم سب کو یہ مٹی کھا جائے گی۔'' سن رسیدہ شخص چلتے چلتے بولا۔

''اوہ'' قیدص اور اسکے منہ سے صرف اتنا نکلا

''ہاں۔۔۔ایک دن یہ مٹی ہم سب کو کھا جائے گی۔ بلندیاں زمین بوس ہوجائیں گی۔ بلندی صرف ایک قوت کے لیے ہے اور وہ۔۔۔وہ وہی عظیم قوت ہے، جس کا میں تم سے ذکر

کررہاتھا۔''

''لیکن وہ ہے کہاں؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''محسوس کرو'' سن رسیدہ شخص نے جواب دیا۔

''کیسے؟''

''اپنے سفر کے مشاہدات کے ذریعے!''

پھر جب وہ اور قیدص اپنے سفر کے مشاہدات کا تجزیہ کرنے لگے تو ان پر عجیب عجیب کیفیتیں منکشف ہونی شروع ہوئیں اور انھیں احساس ہوا کہ ان کا وجود دراصل کچھ بھی نہیں ان کا علم ناقص ہے اور ان کی ہستی ایک ذرّہ۔ جب حقیقت پوری طرح ان پر منکشف ہوئی تو وہ اٹھے اور چلنے لگے۔

''کہاں چلے؟'' سن رسیدہ شخص نے پوچھا

''وہیں۔۔اپنی منزل کی طرف۔۔'' قیدص نے بلندترین پہاڑ کی طرف اشارہ کیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ میں وہاں کا حال جانتا ہوں، کیا تم جانے سے پہلے یہ سننا پسند کروگے کہ وہاں کیا ہے؟''

''ضرور۔۔۔کیوں نہیں'' دونوں نے اشتیاق ظاہر کیا۔

''وہاں۔۔۔اس بلندترین پہاڑ کی بلندترین چوٹی جہاں پر ختم ہوتی ہے بس وہیں سے پاتال کی سرحد شروع ہوتی ہے۔'' سن رسیدہ شخص نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا۔۔۔! پاتال کی سرحد۔ اتنی بلندی پر جانے کے بعد پستی کی سرحدیں۔ وہ دونوں سُن ہوکر رہ گئے۔

''ہاں۔۔۔اب تم کو جانا ہے تو چلے جاؤ۔'' سن رسیدہ شخص یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

قیدص اور وہ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر انھوں نے ایک ارادہ کیا اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سن رسیدہ شخص کے پیچھے چل پڑے۔

دور بلندترین پہاڑ ریزہ ریزہ ہوکر نیچے گررہا تھا۔۔۔!!!''

اکبر زاہد کی انشاء پردازی کے چند اور نمونے ان کے افسانے ''برف گزیدہ لوگ'' سے لیے گئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

افسانہ ''برف گزیدہ لوگ'' سے منتخب کیے ہوئے ان اقتباسات کو ملاحظہ فرمائیں جو نہ صرف منظر نگاری کی عمدہ مثال ہے بلکہ اس منظر نگاری کے ذریعے جس کرب کا اظہار کیا گیا ہے قاری اسے بھی محسوس کرلیتا ہے اور افسانہ نگار کے ساتھ قاری بھی کہانی کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہورہا ہے۔

آیئے یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''سپیدۂ سحر

خاکستری آسمان

جھولتے ہوئے بادل، سبز پتوں پر سفید برف کے ذرّات اور براق لباس اوڑھے خاموش کھوئے کھوئے سے اونچے درخت جن کے جسموں سے چاندنی چھلک رہی تھی۔

موسم کی پہلی برف باری شروع ہوچکی تھی!''

''میں مدہوش سا ایک عجیب سی کیفیت میں سرشار کھویا کھویا چلا آرہا ہوں۔ میرے سامنے حدِنظر تک سفید بے داغ برف کی چادر بچھی ہوئی ہے، جس میں کہیں کہیں سے سبزہ دکھائی دے رہا ہے۔ ہوا میں خنکی سی طاری ہے اور میں اپنے جسم کو اوورکوٹ کے اندر گرمانے کی کوشش کرنے لگتا ہوں۔''

''سفید موسم، سفید دھرتی، سفید لوگ، سفید عمارت اور لال خون۔ سفید اون کے گولے کے مانند ایک جان دار کے جسم سے نکلتا ہوا سرخ خون۔۔!!

''دوپہر

بادلوں کے اوٹ سے جھانکتا ہوا نرم سورج

برف زدہ درخت اپنے جسموں کو جھٹک کر پھر سے سرسبز دکھائی دینے لگے تھے، جیسے بوڑھے یک لخت جوان ہوگئے ہوں۔ دھلا دھلا موسم، دھلی دھلی دھرتی اور دھلی دھلی ایک پرشکوہ عمارت، ایک مسجد!''

ساری کبریائی اور بڑائی اللہ کے لیے ہے۔ پس آؤ اس کی طرف، پس آؤ خیر کی طرف۔۔مسجد کے بلند و بالا میناروں سے خوش الحان آواز یہ صدا دے رہی ہے۔ گھروں کی کھڑکیاں دھیرے سے کھلتی ہیں۔ سہمی سہمی نگاہیں دھند میں ڈوبی بلند و بالا میناروں والی پرشکوہ عمارت کے سامنے کوئی چیز تلاش کررہی ہیں۔

خون آلود ملبہ اور ساکت و جامد کار پر برف کے ذرّات نے ایک غلاف سا اُوڑھا دیا ہے، لیکن سرخ خون کا بے ترتیب سا دائرہ دور ہی سے دکھائی پڑتا ہے۔

کھڑکیوں کے پٹ بند ہوجاتے ہیں۔ چہرے کہیں غائب ہوجاتے ہیں اور میں دیوانہ وار بھاگتا ہوا دھند میں ڈوبی بلند و بالا میناروں والی پُرشکوہ عمارت کے اندر داخل ہوجاتا ہوں،

میرا دل تھرا رہا ہے۔ ضبط کے باوجود آنسو نکل پڑ رہے ہیں۔
میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور سر جھکا ہوا ہے۔
خاموش صدائیں، بولتی آنکھیں، اور چبھتی ہوئی نظریں!
کوئی کسی سے کیا کہے، سارے سفید پوش اور دُھلے ہوئے لوگ شاید کہیں چلے گئے، کھڑکیوں کے پٹ بند ہوئے تو شاید دلوں کے دروازے بھی بند ہوگئے۔ مینار سینہ تانے کھڑے ہیں لیکن صحن سَر نگوں ہو چکا ہے۔ صفیں اپنی تنہائی پر اداس ہیں، دو آدمی اور ایک میں۔ بس یہ تین نفوس اس تنہائی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کررہے ہیں۔ دو آدمیوں کے ساتھ ان کے پیٹ کا مسئلہ لگا ہوا ہے اس لیے وہ مجبوراً موجود ہیں۔ ابھی ابھی کہیں سے اڑتا ہوا ایک گِدھ آکر مینار پر بیٹھ گیا ہے۔ شاید راہ بھٹک گیا ہو!!''

''میں کچھ بولنا چاہتا ہوں لیکن کیسے بولوں، کیوں کہ میں تو محض ایک آوارہ گرد ہوں، آوارہ گرد اور گونگا۔۔۔
اور میرے اطراف برف گزیدہ لوگ۔۔۔!!''

اکبر زاہد کا ایک اور افسانہ ''اِکائی کا المیہ'' ہے جس میں انھوں نے تخلیق کائنات سے لے کر کائنات کے ختم ہونے تک کی داستان بیان کردی ہے۔

اِکائی کا المیہ سے چند اقتباسات درج ہیں:

''یہ اُس وقت کی بات ہے جب ابھی سورج کی تخلیق نہیں ہوئی تھی۔ تب وہ صرف ایک اکائی تھا۔ اپنے آپ میں گم۔ اپنی ذات کی بیکراں وسعتوں میں کھویا ہوا، اپنے وجود کو محسوس کرتا اور خوش ہوتا تھا۔ اُس وقت ضرورت بے معنی تھی اور حاجت ایک بہت بڑا سوالیہ نشان۔ روشنی کی تب کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہر چیز بالکل عیاں اور صاف تھی۔ وحدت کا نور ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ وہاں اندھیرے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ بالکل آزاد ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا، ذہن عجیب عجیب باتیں سوچتا، اس کے سامنے نئی نئی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ باوجود یہ چیزیں نئی ہونے کے اسے جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں کی کوئی بھی چیز نامعلوم نہیں ہے۔''

''وقت صدیوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹتا رہا۔ نجانے کتنے سورج اس کی آغوش میں جاکر گم ہوگئے۔ نہ جانے کتنے حادثات، نہ جانے کتنے انقلابات، وقت ان سب کا مورخ رہا اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ وہ بکھر کر رہ گیا۔ اس کے کئی ہزار ملین ٹکڑے ہوئے اور ایک ایک ٹکڑا کئی کئی حصوں میں بٹ گیا۔ یہ ترقی کی معراج تھی۔''

ایک دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں:

''اور اس سے پہلے کہ دونوں خانے ایک دوسرے پر پل پڑتے ایک خوف ناک گرج کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی تیز آندھی نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جمادات، حیوانات، نباتات سب اس کی زد میں آگئے، بلند ترین پہاڑ بکھر کر رہ گئے۔ سمندر ابلنے لگے اور تمام خانے اس آندھی کی لپیٹ میں آکر اپنا وجود کھو بیٹھے۔

زمین چلنے لگی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر چیز چکّی میں پسی جارہی ہو۔ نیلے رنگ کا آسمان اور مٹیالی زمین آپس میں مل چکے تھے۔

اور پھر جب کچھ بھی باقی نہیں رہا اور انتہا اپنی ابتدا کی طرح ہوگئی تو نور کی وہی کرن نمودار ہوئی جو آج سے کئی ہزار سال پہلے نمودار ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے روشنی کی یہ کرن پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ ہر شئے اس کے اندر سما گئی۔ اور تب وہ تمام خانے جو اپنے وجود کو گم کر بیٹھے تھے ایک دوسرے میں سمٹنے لگے۔ اب نہ تو مغرب تھا اور نہ ہی مشرق۔ سب آپس میں مل کر ایک بہت بڑی اکائی بن گئے اور یہ بہت بڑی اکائی خود اس کی اپنی ذات تھی۔ اب وہ پھر ایک اکائی تھا۔ سورج کو تخلیق ہوئے کئی لاکھ برس بیت چکے تھے اور وہ نورانی کرن کے سامنے سر جھکائے کھڑا ان کئی لاکھ برسوں کا حساب دے رہا تھا۔''

آخر میں مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ کوئی بھی لٹریچر انشاء پردازی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کا شمار ادبِ عالیہ میں کیا جاسکتا ہے۔ اکبر زاہد کے افسانے انشاء پردازی کی اعلیٰ مثال پیش کرتے ہیں اور امید ہے کہ آنے والی نسلیں ان کے افسانوں سے تحریک پاکر انشاء پردازی میں نئے تجربات کرنے کا حوصلہ پیدا کریں گی۔□□□

Dr. Fouzia Habeeb
Assistant Prof.
Islamiah Women's College
New Town, Vaniyambadi-635751 (Tamil Nadu)

افزا خاتون

مسرور جہاں کا افسانہ 'کہاں ہو تم' پر ایک نظر

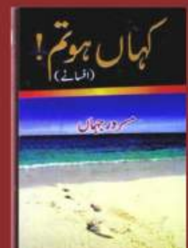

اودھ ہمیشہ سے ہی علم و ادب کا مرکز و منبع رہا ہے جہاں ایک طرف انیس و دبیر ناسخ اور آتش نے اپنے مرثیوں اور غزلوں کے ذریعہ اردو ادب کو ایک بہترین اثاثہ فراہم کیا وہی دوسری طرف اودھ کی خواتین بھی اس میدان میں پیچھے نہیں رہیں انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ ادب کے دامن میں قابل قدر اضافہ کیا انھیں خواتین افسانہ نگاروں میں مسرور جہاں کا نام سرفہرست آتا ہے جنھوں نے زیادہ سے زیادہ ناول اور 300 کے قریب افسانے لکھ کر اپنی لازوال تحریروں سے ادب کو مالا مال کیا لیکن بدقسمتی سے ان کو وہ مقام نہ مل سکا جس کی وہ حقدار تھیں۔ مسرور جہاں کی پیدائش فتح پور بارہ بنکی میں ہوئی ان کے دادا کو اپنی شادی کے بعد یہ علاقہ اتنا پسند آیا تھا کہ اسی کو اپنا مسکن بنالیا ان کے گھر کا ماحول ادبی تھا اسی ادبی ماحول میں ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ ادبی ماحول ملنے کی وجہ سے انھیں بچپن سے ہی کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا دھیرے دھیرے یہ شوق افسانہ لکھنے کی طرف منتقل ہو گیا۔ مسرور جہاں کو اعلی تعلیم حاصل کرنے کا بہترین موقع نہ مل سکا محض ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کر سکیں لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں اور بھرپور محنت و مشقت کی بنا پر ادب میں وہ مقام حاصل کیا جو ایک ادیبہ کا خواب ہوتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب خواتین کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن پھر بھی انھوں نے افسانہ اور ناول لکھے اور خوب لکھے ان کی پہلی کہانی "ایک حقیقت جو خواب بنکر رہ گئی" صرف 14 سال کی عمر میں شائع ہوئی تھی۔ ان کے افسانوں میں کنجی؛ جلاوطن ؛اپنا سورج اپنا چاند؛ شانتی، ہمیں جینے دو؛ آج کی سیتا کل کی سیتا؛ کہاں ہو تم بہت ہی مشہور و معروف افسانے ہیں۔ انھیں مشہور افسانوں میں سے ایک افسانہ" کہاں ہو تم" پر تجزیہ کرنے جا رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا افسانہ ہے جسے انھوں نے اپنے بیٹے کے جدا ہونے پر ان کی یاد میں تحریر کیا تھا اس افسانہ کے متعلق ڈاکٹر تسنیم بانو لکھتی ہیں۔

> ''مسرور جہاں نے اپنا افسانہ'' کہاں ہو تم'' اپنے بیٹے کی یاد میں تحریر کیا ہے اس میں انھوں نے بچپن سے لے کر جوانی تک کے تمام لمحات ،احساسات و جذبات کے ساتھ ساتھ اپنی معاشرتی اور زندگی کے مختلف کارناموں کا تذکرہ کیا ہے''

(مسرور جہاں کی کہانیوں میں تانثیت کے افکار، ڈاکٹر تسنیم بانو ایوان اردو، دہلی، جنوری 2020، صفحہ نمبر 30)

دوسری جگہ ڈاکٹر پروین شجاعت کو دیے گئے انٹرویو میں مسرور جہاں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ۔

> ''بدنصیبی کا تعلق انسانوں سے ہوتا ہے یہ دراصل میری زندگی کا ایسا المیہ ہے جس نے مجھے توڑ پھوڑ کر کرچیوں میں تبدیل کردیا''

(مسرور جہاں شخصیت کے آئینہ میں، ڈاکٹر پروین شجاعت، نیا دور، ستمبر 2019، صفحہ نمبر 44)

یہ افسانہ صرف ان کے بیٹے کی زندگی کے تمام پہلو کو اجاگر ہی نہیں کرتا ہے بلکہ اس دور کو بھی نمایا کرتا ہے جہاں خواتین کو تعلیم کا شوق دیکھ کر انھیں سپورٹ کرنے کے بجائے طعنے دیے جاتے تھے اسی افسانہ کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ بیٹے میں ماں کا اثر آیا ہے گویا پڑھنا لکھنا بھی کوئی متعدی مرض تھا جو ورثہ میں اس نے اپنے بیٹے کو منتقل کر دیا تھا اگر باپ زندہ ہوتا تو وہ بھی اس کے نکما پن پر رنج کرتا اسے تو بیوی کے ہاتھ میں بھی قلم دیکھ کر سخت شکایت ہوتی تھی اور وہ اسے اکثر و بیشتر فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کا طعنہ دیتا اور شوق کی ماری اسے صبر و شکر سے برداشت کرتی۔''

(افسانوی مجموعہ کہاں ہو تم افسانہ کہاں ہو تم، مسرور جہاں، صفحہ نمبر 62)

افسانہ'' کہاں ہو تم'' اس دور کہ ذہنیت کی بھی عکاسی کرتا ہے جہاں سچ لکھنے یا بولنے والوں کو لوگ ناپسند کرتے ہیں اسے ڈراتے دھمکاتے ہیں تا کہ وہ سچ لکھنے سے باز آجایئے جیسا وہ لوگ خود لکھنا پسند کرتے ہیں جھوٹ پر مبنی تحریریں ، جانب دارانہ رویہ اور مفاد پرست تحریریں انکا خاص شغف ہوا کرتی ہیں۔ وقار ناصری مسرور جہاں کے مشہور افسانوی مجموعہ

''ہمیں جینے دو'' کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔

''کہاں ہوتم عہد حاضر کا المیہ ہے مصلحتوں اور سمجھوتوں کے اس دور میں حق گوئی اور راست بیانی کا انجام کیا ہوتا ہے یہ افسانہ کی روداد ہے۔ یہ ایک باصلاحیت دیانتدار بے باک صحافی کی کہانی ہی جسے اس کی ماں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی مگر جب وہ ایک کامیاب صحافی بن کر ابھرا تو اس کے ہم پیشہ اس سے حسد کرنے لگے اس کی ذہانت کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے تھے لیکن سازشیں کر کر کے اسے پریشان کرنے لگے وہ ایک اخبار سے دوسرے اخبار تک اسی طرح پریشان پھرتا رہا مگر اس نے کبھی مصلحتوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔''

(مسرور جہاں کے افسانے وقار ناصری افسانوی مجموعہ، ہمیں جینے دو مصنفہ، مسرور جہاں صفحہ نمبر 16)

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جو کسی کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر رشک کرتے ہیں اور اس کو اپنا Ideal مانتے ہوا اس کی طرح محنت کر کے اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں یا اس سے زیادہ محنت کر کے آگے بڑھنا چاہتے ہیں وہیں دوسری طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس کے علم و ہنر کی بنا پر بغض وحسد سے کام لیتے ہیں اس کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرنے لگتے ہیں کچھ لوگوں کے پاس ان سازشوں کو پست کرنے کے حربہ موجود ہوتے ہیں جسے وہ استعمال کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور جس کے پاس ایسا کچھ نہیں ہوتا وہ ان سازشوں کا شکار ہو جاتا ہے اس کے بعد یا تو وہ گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے یا پھر دنیا کو ہی الوداع کہہ دیتا ہے اس صحافی کا انجام بھی دنیا کو چھوڑ جانے کی صورت میں نظر آتا ہے۔ وقار ناصری لکھتے ہیں:

''بیرون ملک کے اخبار کی ملازمت ملی تو وہاں کا انگریز ایڈیٹر اس کی قابلیت کا اعتراف کرنے کے بجائے اس کا دشمن بن بیٹھا وہ بھی اس لیے کہ ایک غلام ملک کا صحافی ذہانت میں اس سے آگے کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کی تحریریں اس سے بہتر کیونکر ہو سکتی ہیں اس نے وہاں کی ملازمت بھی چھوڑ دی اور اپنے ملک کی ایک اشتہاری کمپنی میں ملازمت کر لی یہاں بھی اسے وہی لوگ ملے جو اس کے جیسا لکھ تو نہیں سکتے تھے مگر اس کی تحریروں کو غایب کر کے اس کے خلاف سازشیں تو کر سکتے تھے لیکن اس نے ہار نہ مانی وہ لکھتا رہا بڑے بڑے اخباروں میں اس کی تحریریں شائع ہوتی رہی مگر ایک دن سازشی ٹولے نے کچھ ایسا کیا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر چل دیا اسی راستہ پر جس پر اس سے پہلے بھی کئی لوگ ایسی دیانت اور حق گوئی کے نشانات چھوڑ کر بہت دور جا چکے ہیں''

(مسرور جہاں کے افسانے، وقار ناصری، افسانوی مجموعہ ہمیں جینے، دو صفحہ نمبر 17)

ایک سچے اور ایماندار صحافی کو اپنے موضوع سے انصاف کرنے کے لیے اس کی ساری حقیقتوں کو سامنے لانے کے لیے کتنی کوشش محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے" افسانہ کہاں ہو تم" اس بات کی بخوبی وضاحت کرتا ہے اور یہی محنت و مشقت جستجو انسان کو ایک کامیاب شخص بنا دیتی ہے۔ افسانہ کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

''وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتا اس سے پورا انصاف کرتا اس کے لیے اسے بار بار سفر کرنا پڑتا تب کہیں جا کر وہ مطمئن ہوتا گہرہ مشاہدہ، عمیق مطالعہ اور ذاتی تجربہ اسکی گونا گوں کامیابیوں میں اہم کردار ادا کرتے۔''

(افسانہ کہاں ہو تم، افسانوی مجموعہ کہاں ہو تم، مسرور جہاں، صفحہ نمبر 62)

مسرور جہاں کے افسانوں کی خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اندیکھی چیز کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ وہ قاری کے سامنے چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے ان کے افسانوں کے کچھ تجربہ ایسے بھی ہیں جو بولتے ہو منظر نامہ کی یاد دلاتے ہیں کرداروں کے تعارف میں ضروری اور غیر ضروری تفصیلات کا کوئی ذکر اور گوشہ تشنہ نہیں رہ جاتا۔ وہیں مجرد اور عالم محسوسات کی اشیاء اور عناصر کو بھی اس طرح پیش کرتی ہے کہ اس کا وجود بھی قصہ کا جز بن جاتا ہے۔ مسرور جہاں کے افسانہ وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک افسانہ میں ہونی چاہیے فن اور دلکشی کے معیار پر ان کے افسانے پورے اترتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچ لاتے ہیں اور ایک تاثر قائم کر دیتے ہیں انھوں نے خاصی تعداد میں افسانے لکھ کر اردو ادب کے خزانہ میں بیش بہا اضافہ کر دیا۔

بلاشبہ مسرور جہاں اردو ادب کی ایک بڑی تخلیق کار رہی ہیں جن کے ناول اور افسانہ ادبی دنیا میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ مسرور جہاں کی ادبی خدمات کو دنیا ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جا گا۔

□□□

Afza Khatoon
541-A/Pn-067,Roshan Nagar
New Haiderganj, Thakurganj
Lucknow-226003 (U.P)
Mobile: 7317836988

انزلا فاروقی

آنگن آنگن پروائی

رفیعہ شبنم عابدی

کب تک اس کے سر پر ہوگا دالانوں کا سورج راج
جانے کا بے خوف چلے گی آنگن آنگن پروائی

رفیعہ شبنم عابدی دورِ جدید کی ایک ممتاز شاعرہ ہیں۔ افسانہ نگاری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کرنے والی رفیعہ شبنم عابدی کا شمار ان شاعرات میں ہوتا ہے، جنھوں نے 1960 کے بعد اپنی شناخت قائم کی۔ رفیعہ شبنم عابدی ادب کی ایک مشہور و معروف شاعرہ ہیں۔ اب تک ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ رفیعہ شبنم عابدی کا پہلا شعری مجموعہ ''موسم بھیگی آنکھوں کا'' 1985 میں منظر عام پر آیا۔ ''اگلی رُت کے آنے تک''، ''نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں'' اور ''آنگن آنگن پروائی'' ان کے دیگر شعری مجموعے ہیں۔ 'آنگن آنگن پروائی' 2009 میں شائع ہوا جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی باشعور اور پختہ ذہن کی شاعرہ ہیں، جن کی نظموں اور غزلوں کا مطالعہ کرنے پر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری کے موضوعات اور ان کے خیالات منفرد ہیں۔ جو ان کو دیگر شاعرات سے الگ کرتے ہیں۔ رفیعہ شبنم عابدی نے جس دور میں اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ اس وقت ''تانیثی تحریک'' پر بہت زور و شور سے لکھا جا رہا تھا۔ خواتین کے حقوق کے لیے آوازیں بلند کی جا رہی تھیں۔ ان میں کچھ آوازیں باغی رُخ اختیار کیے ہوئے تھیں۔ رفیعہ شبنم عابدی کے کلام میں بھی نسائیت کا رنگ ہے لیکن بڑے ہی شائستہ انداز میں، بغاوت پر نہیں اترتیں۔ بلکہ نرم لہجے اور بڑے پیارے انداز میں اپنی بات کہتی ہیں جو اثر رکھتی ہے۔ انھوں نے بھی عورتوں کے حقوق کے لئے آواز اٹھائی ہے لیکن انتہا پسندی سے اپنی شاعری کو دور رکھا ہے۔ اپنے اسی منفرد انداز فکر کے لیے وہ جانی جاتی ہیں وہ خود کہتی ہیں:

> ''بہت سے سوالات ہیں جو اپنے جوابوں کی تلاش میں صدیوں سے میرے اندر بھٹک رہے ہیں۔ لیکن خاموشی اور نارسائی کے اس جنگل میں، بے حسی کے اس صحرائے بے کراں میں، جسے عالم شش جہات کہا گیا ہے، میری اس بے چین روح کی آواز کون سنے؟ یہاں تو سناٹے بھی گونگے بہرے ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی دہشت گردی کا الزام ہو، کسی فرضی گناہ کا یا جذبات اور رشتوں کی بے حرمتی کا۔ کیا یہ کم

ہے کہ ہر عورت ہر دور میں ہر جگہ سماج کے اس رویے کو خاموشی اور صبر کے ساتھ ساتھ سہتی اور جرأت کے ساتھ معاف کرتی چلی آئی ہے۔ پس میں کیا اور کوئی اور شاعرہ کیا عورت کم بخت کا دل ہی ایسا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ کہ یہ دل بہر حال ماں کا دل ہے اور ماں کبھی ڈائن نہیں ہوتی دشمن کی بھی نہیں۔

''میری خواہش ہے کہ میری شاعری ان ہی احساسات کے تناظر میں پڑھی جائے، تاکہ اس کی صحیح منصفانہ نہ اور اور ایماندارانہ تفہیم ہو سکے۔ کسی بے باک تانیثی شاعرہ کی روشنی میں نہیں۔'' (آنگن آنگن پروائی رفیعہ شبنم عابدی صفحہ نمبر 13)

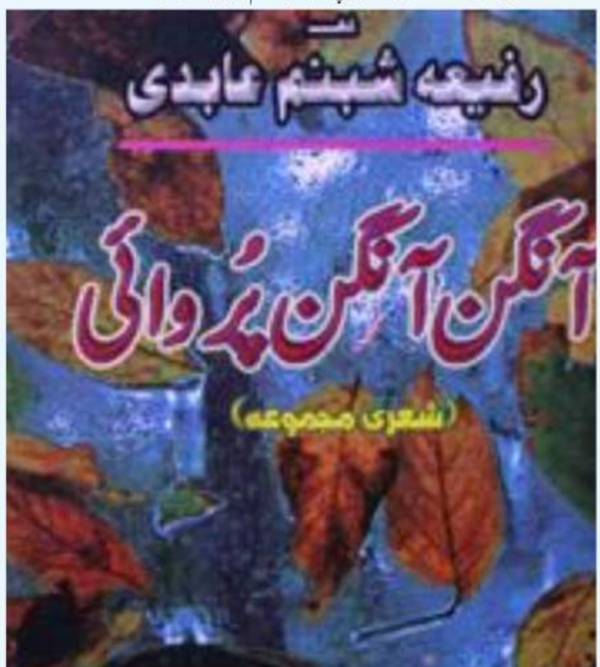

رفیعہ شبنم عابدی کے یہاں جذبات، احساسات، سیاست، سماجیات اور نسائی حسیت پر کثرت سے اشعار ملتے ہیں۔ ان تمام احساسات وخیالات کی عکاسی میں رفیعہ شبنم عابدی پژمردہ نہیں پر امید ہیں جوان کے باشعور، تعلیم یافتہ اور حساس ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ رفیعہ شبنم عابدی اپنی شاعری کے بارے میں لکھتی ہیں:

''نو دس سال کی عمر سے آج تک میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے، دیکھا ہے، وہی لکھا ہے۔ میری شاعری میری فکر و احساس کے ارتقائی سفر کی داستان ہے۔۔۔۔ اس میں میری اور صرف میرے دل کی دھڑکنیں شامل ہیں۔ اگر اوروں کے غم بھی ہیں تو میں نے انہیں ایسے سمیٹا ہے، جیسے میرے اپنے ہی غم ہوں۔ جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کرنے کا فن ہی تو شاعری ہے۔'' (آنگن آنگن پروائی رفیعہ شبنم عابدی صفحہ نمبر 14)

کمالِ فن ہے سلیقے سے بات کر جانا
سخن کا سادہ لباسی میں بھی سنور جانا

رفیعہ شبنم عابدی کا تعلق ایک دینی، علمی و ادبی خانوادے سے ہے۔ جس کی تعلیمات اور تربیت ان کی مہذب شخصیت میں جھلکتی ہے، اپنے ہر شعری مجموعے کا آغاز انھوں نے حمد و نعت اور منقبت سے کیا ہے۔ رفیعہ شبنم عابدی نے اپنی تخلیقی بصیرت اور ذہنی فعالیت کے ذریعے اپنی ایک منفرد پہچان قائم کی ہے۔ آنگن آنگن پروائی میں شامل کلام میں خوش نما رنگ، میٹھے بول، شگفتہ انداز، تروتازگی کے جھونکے، محبت کی نغمگی، دلکشی، سادگی، ساختگی، بیان کی رنگینی اور نسائی لب و لہجے کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع اور فکری کینوس بہت وسیع ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ سلونا خوش ادا شیریں سخن اچھا لگا
تمکنت کے ساتھ اس کا بانکپن اچھا لگا
جس گھڑی آئی میرے بادل کے آنے کی خبر
یہ زمیں اچھی لگی نیلا گگن اچھا لگا

غزل کے چند اشعار:

زباں پہ حرفِ شکایت کبھی نہ لاؤں میں
وہ چاہتا ہے کہ غم میں بھی مسکراؤں میں

سوال یہ ہے کہ آخر میری خطا کیا ہے
سوال اس کا نہیں، کیوں سزا نہ پاؤں میں

دہکتی آگ میں اس کا بھی امتحان تو ہو
یہ کیسی شرط کہ ہر بار ہار جاؤں میں

جلی ہوں دھوپ میں جبر و ستم کی برسوں تک
ملے جو حق تو کوئی سائباں بناؤں میں

رفیعہ شبنم عابدی نے معاملات عشق کی تمام کیفیات کو اپنی نسوانی آواز میں انوکھی تشبیہات اور نرم لہجے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جہاں خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ خودسپردگی کا جذبہ بھی ہے۔:

تمام عمر تیرے ساتھ کاٹ دی ہنس کر
کوئی تو کام ہمیں شاندار کرنا تھا

رفیعہ شبنم عابدی نے اپنی زندگی کے تخلیقی سفر میں میں جذبے، احساس اور شعور کے بڑے فاصلے طے کیے ہیں اور اپنی شعری کائنات کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ 'آنگن آنگن پروائی' میں ہم جس نوعیت کی شاعری دیکھتے ہیں، اس میں ایک خوداعتماد حساس دل محبت کرنے والی عورت کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ اپنے محبوب سے شکوے تو کرتی ہے، ساتھ میں بے پناہ محبت بھی کرتی ہے۔

غزل کے چند اشعار:

کوئی شکوہ نہ شکایت گلہ ہے جاناں
ہم نے ہر ظلم سلیقے سے سہا ہے جاناں

بے گناہوں پہ ستم لطف گنہگاروں پر
مملکت میں تیری کیا کیا روا ہے جاناں

کب یہ چاہا میری پہچان بنے تیرے بغیر
مانگ میں میری تیرا نام سجا ہے جاناں

تو جہاں بھی رہے، خنداں رہے، شاداب رہے
آج بھی لب پے یہی ایک دعا ہے جاناں

شبنم اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا
"تمہیں چاہا، تمہیں لاکھوں میں چنا ہے جاناں"

☆☆☆

جذبات کی سچائی اور طرزِ اظہار کی دلکشی رفیعہ شبنم عابدی کی شاعری کی روح ہے۔ وہ جو محسوس کرتی ہیں اسی کو اشعار میں ڈھال دیتی ہیں۔ 'آنگن آنگن پروائی' میں شامل کلام ان کے جذبات واحساسات اور نفسیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی غزلوں میں سمندر کی گہرائی اور گیرائی ہے۔ وصل کے جذبوں کی عکاسی، ہجر کے لمحات کی کسک ہے۔ زندگی اور معاشرت کی تبدیلیوں کی روشنی میں انھوں نے اپنی شاعری میں بھی بہت سی تبدیلیاں کی ہیں۔ وقت کے ساتھ معاشرے میں آئیں تبدیلیوں کو محسوس کرنا اور ان کو شاعری میں ڈھالنے کا فن ان کو خوب آتا ہے:

کیسی پروائی تھی جو پیاس کے جنگل میں رہی
ایک بادل کے لیے ریت کے دلدل میں رہی

جتنی رتوں کی تبدیلی ہے وقت کی ساری سرگرمی ہے
اب وہ موم صفت ہیں شبنم پہلے تھے سیماب بہت

☆☆☆

رفیعہ شبنم عابدی نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اور اس کے تمام نشیب وفراز کو اشعار کے ذریعے دنیائے ادب میں اجاگر کیا ہے۔ ان کی شاعری کا لب ولہجہ تیکھا نہیں بلکہ ان کے لہجے میں شائستگی موجود ہے جو شیریں لفظیات کے ساتھ اپنی بات کو موثر انداز میں کہتی ہیں۔ آنگن آنگن پروائی کی آخری غزلوں میں رفیعہ شبنم عابدی نے خوداعتمادی اور خودداری سے بھرپور غزلیں کہیں ہیں۔ مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ آنگن آنگن پروائی ایک حساس شاعرہ کے پختہ ذہن کی وہ ہوائیں ہیں جو ہر آنگن میں تازگی بکھیرتی چلی جاتی ہیں۔

عزت نفس کو مٹی میں ملائیں گے نہیں
وہ بلائیں بھی تو ہم لوٹ کے جائیں گے نہیں

آپ خود سر ہیں مگر ہم بھی ہیں خود دار بہت
آپ مانیں گے نہیں ہم بھی منائیں گے نہیں

غریقِ گریہ و ماتم نہیں ہوں
پریشاں ہوں مگر پیہم نہیں ہوں

یہ مانا شاعری اک فن ہے شبنم
میں اس فن میں کسی سے کم نہیں ہوں

□□□

Unzila Farooqui
Research Scholar
University of Delhi
Delhi-110007
unzilaurooj@gmail.com

ثنا غزل

محمد انصار اللہ کی ذوق شناسی

محمد انصار اللہ نے ذوق کی شاعری اور ان کی حیات کا بڑی گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کر لیا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ 1956 سے 1968 تک انھوں نے ذوق کے تعلق سے تقریباً پینتیس تحقیقی مضامین تحریر کر ڈالے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی تحقیق کی شروعات ہی ذوق سے ہوئی۔ ذوق ہی کے متعلق انھوں نے اپنا پہلا تحقیقی مضمون تحریر کیا۔ جو کہ علامہ نیاز فتح پوری کے رسالے 'نگار' میں شائع ہوا۔ اس کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ اردو کا لکچر منتخب ہونے کے بعد انھیں پہلی کلاس شاعری کی ملی جس میں انھیں ذوق کی ایک غزل پڑھانی تھی۔ جب انھوں نے مذکورہ غزل پڑھانی شروع کی تو اس کے ایک شعر کے تعلق سے شبہ ہوا کہ یہ غلط ہے۔ اس حقیقت کی دریافت کے لیے انھوں نے ایک مضمون تحریر کیا جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

"1955 میں جب والد مرحوم مرزا پور میں تھے میں وہاں بابو جیسوال انٹر کالج میں عارضی طور پر اردو پڑھانے پر معمور ہوا۔ پہلے ہی دن شیخ ذوق کی ایک غزل سامنے آئی جس کا ایک شعر اس طرح تھا

تن خمیدہ پر اپنے ہے بال مذہب و بال
اثاثہ کچھ تو رہے خانہ کماں کے لیے

اول تو پہلا مصرع پڑھا ہی نہ گیا۔ پھر میں نے ہر چند غور کیا خانہ کماں میں اثاثہ کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے لڑکوں سے کہا کہ "یہ شعر ذوق کا نہیں ہوسکتا" یقین ہے کہ لڑکوں نے میرے بارے میں بری رائے قائم کی ہوگی۔ لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے صحیح غزل کی جستجو کی اسی سے متعلق میں نے وہ پہلا مضمون لکھا جو نیاز فتحپوری کے "نگار" میں چھپا تھا۔" (ماہنامہ، روشن، شمارہ نمبر 2، 1990، ص 15)

یہیں سے ان کے تحقیقی مضامین کا سلسلہ شروع ہوا جو تاعمر چلتا رہا۔ ذوق علم نجوم، علم ہیت، علم طب، علم منطق، علم فلسفہ، علم فقہ، علم تصوف، علم تفسیر، علم حدیث، علم تاریخ، علم موسیقی سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ محمد انصار اللہ نے ان کی زندگی کے تقریباً تمام گوشوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ذوق کی شاعری کا موازنہ بعض دوسرے شعرا کے کلام سے بھی کیا ہے۔

محمد انصار اللہ نے مولانا محمد حسین آزاد کے مرتب کردہ دیوان ذوق پر ایک مضمون "دیوان ذوق مرتبہ آزاد پر ایک نظر" تحریر کیا جو ماہنامہ نگار لکھنؤ مارچ 1958 میں شائع ہوا۔ آزاد کا اپنے استاد ذوق سے بے انتہا جذباتی اور قلبی لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ 1857 کے غدر میں انھوں نے ہر شے کو چھوڑ کر استاد کا دیوان بغل میں دبایا اور دہلی سے نکل پڑے کہ اگر چہ ہر چیز برباد ہو جائے مگر استاد کا دیوان محفوظ رہے۔ لیکن اسی دیوان کی

ترتیب کے وقت انھوں نے کچھ ایسی تساہلی برتی کہ کچھ دیگر شعرا کے اشعار دیوان ذوق میں شامل ہو گئے۔ اس کے علاوہ 'آب حیات' میں بھی بعض اشعار کو غلط طریقے سے درج کر لیا گیا ہے، جسے انصار اللہ نے نشان زد کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

"شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد دہلوی نے جس محنت و کاوش سے اپنے استاد خان بہادر شیخ ابراہیم ذوق دہلوی کا کلام جمع کیا اور جس خوش سلیقگی سے اسے مرتب کیا یقیناً وہ قابل تعریف ہے۔ اس کی ترتیب میں مولانا نے بقول خود "دس مہینے دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے" لیکن پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کلام کے جمع کرنے میں کما حقہ تلاش و تجسس سے کام نہیں لیا، ممکن ہے کہ کسی مصروفیت کے سبب ایسا ہوا ہو لیکن بہر حال یہ افسوس ناک حقیقت ہے۔

اس دیوان ذوق میں غور کیجیے تو بعض اشعار ایسے بھی مل جائیں گے جو دوسرے اساتذہ کے ہیں لیکن کسی غلط فہمی کی بنا پر مولانا اس کو اپنے استاد کے دیوان میں شریک کر بیٹھے۔"

(ماہنامہ نگار، مارچ 1958، ص: 31)

انصار اللہ نے ان پر تساہلی اور غیر دیانت داری کا الزام یوں ہی نہیں لگایا ہے بلکہ اس کے ٹھوس شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ ممکن ہے اس وقت حالات سازگار نہ رہے ہوں یا مولانا عدم فرصتی کے شکار رہے ہوں اور وہ اپنے استاد کا دیوان یہ سوچ کر شائع کرا دینا چاہتے رہے ہوں کہ وہ محفوظ ہو جائے پھر بعد میں اسے از سر نو مرتب کر لیا جائے گا۔ محمد حسین آزاد جیسی شخصیت سے یہی توقع کی جا سکتی ہے۔ انصار اللہ نے آزاد کے مذکورہ کام کا جس باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی خطاؤں کی جس طرح گرفت کی ہے، اس کی ایک مثال اور ملاحظہ کیجیے:

"بہادر شاہ ظفر کو تو خیر جانے دیجئے جن کی غزلیں مولانا نہایت اطمینان سے اپنے استاد کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، مثال کے طور پر دیکھیے۔

مزا چکھایا ہے کوہکن کو جو عشق آیا ہے امتحاں پر
کہ لایا تو جوئے شیر لیکن چھٹی کا دودھ آ گیا زباں پر

اسی غزل کے متعلق مولانا کا ارشاد ہے:

"استاد مرحوم بادشاہ کے سامنے اپنا شعر یا غزل نہ پڑھتے تھے طبیعت سے واقف تھے۔۔۔ جب ایسا موقع ہوتا تو اپنی غزل میں ان کا تخلص ڈال کر بھیج دیتے۔۔۔ جب بادشاہ کا پہلا دیوان چھپ کر آیا تو مجھے یاد ہے۔ والد مرحوم نے غزل مرقوم الذیل دیکھ کر مجھ سے کہا دیکھو یہ غزل بھی بادشاہ کو دے دی لڑکپن کی ہے۔ والد کو پہلے سے ہی ساری یاد تھی۔"

حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ظفر کا پہلا دیوان 1807ء/1223ھ میں شائع ہو چکا تھا اور مولانا 1832 میں پیدا ہوئے، پیدائش سے 35 برس قبل کے واقعے کے متعلق مولانا کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔ یہی نہیں بلکہ استاد ذوق 1807ء/1224ھ میں میر کاظم حسین بے قرار کی جگہ ولی عہد کو اصلاح دینے پر مامور ہوئے، چنانچہ دیوان اول کی کسی غزل کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ذوق کی ہے یا ذوق کی اصلاح کردہ ہے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں غزل مذکورہ کی بحر بہادر شاہ کی پسندیدہ ترین بحر ہے اور استاد کے دیوان میں اس بحر میں کوئی دوسری کاوش نہیں ملتی۔ اس غزل کے مقطع پر غور فرمائیے۔

کہاں رہی مجھ میں جاں ہے باقی کہ ہے دھواں ہو کے لب پہ آتی
جو ذوق/ظفر جو آنسو کی بوند ٹپکی ہمارے دل طپاں پر

اہل ذوق اس بات کو خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس مقطع میں ظفر کا تخلص ذوق سے زیادہ کھپتا ہے لیکن بہر حال مولانا کا فیصلہ بھی یقیناً کسی بنیاد ہی پر ہوگا۔" (ماہنامہ نگار، مارچ 1958، ص: 31)

محمد انصار اللہ کی گفتگو میں ایک طرح کی عاجزی اور خوش فہمی کی جھلک ہے۔ بزرگوں کے کاموں میں جو خلوص ہوا کرتا تھا وہ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے ورنہ دلیلیں ساری ان کے خلاف نظر آتی ہیں اور اس سے انصار اللہ کی ایمان داری اور منکسر المزاجی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ بھی کہ ان کی قیاسی باتوں کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی سیاق موجود ہوتا ہے۔ خامیاں دکھانے کے پیچھے ان کا یہ مقصد قطعی نہیں ہوتا کہ کسی کو بدنام کیا جائے بلکہ وہ تو خامیوں کی گرفت کے باوجود مواد کے لیے صرف ہوئی محنت، لگن اور کاوش کی دل کھول کر تعریف کیا کرتے ہیں، جیسا کہ انھوں نے اس مضمون میں کیا ہے اور اپنے استاد سے ان کی محبت کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس سے بس انصار اللہ کی چاہت اتنی سی ہے کہ کوئی محقق ذوق کے دیوان کی صحیح اور تاریخ وار ترتیب کا کام اپنے ذمہ لے لے۔ حالاں کہ کام کا ادھورا پن دیکھ کر انھوں نے خود اسے اپنے ذمہ لیا تھا، بقول ان کے:

"میں کوشش کر رہا ہوں خدا کامیاب کرے۔ آمین"

(ماہنامہ نگار، مارچ 1958، ص: 35)

لیکن مجھے اس کے مکمل ہونے کا کوئی ثبوت اب تک نہیں ملا ہے،

غالباً یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔

استاد ذوق مختلف علوم وفنون میں اچھی دست گاہ رکھتے تھے جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ شاعری میں اس کا بہ موقع ومحل استعمال بھی کیا کرتے تھے۔ اس کا بھی ذکر آ چکا ہے کہ آزاد نے آب حیات میں اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا لیکن انصاراللہ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مختلف علوم وفنون کے حوالے سے کئی مضامین قلم بند کر کے بڑی تفصیل سے ان پر روشنی ڈالی ہے اور حتی الامکان تشنگی مٹانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں ذوق کی علمیت کا اعتراف کرتے ہوئے واضح طور پر لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں اتنے علوم وفنون ذوق سے پہلے خواجہ امیر خسرو کے بعد شاید کسی نے حاصل نہیں کیے۔ ان علوم کے حصول کے علاوہ ذوق نے ان کو اپنی شاعری کا جزو بنا کر ادب وشعر پر جو احسان کیا ہے وہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔''

(''ذوق اور علم موسیقی''، ماہنامہ نگار، ستمبر 1958، ص:39)

اس مضمون کے ذریعے انصاراللہ نے ان لوگوں کا منہ بند کر دیا جو ذوق کو علم موسیقی سے بے بہرہ اور ترنم سے نا آشنا کہا کرتے تھے۔ انھوں نے دلیلوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ ذوق کی غزلیں موسیقیت سے قطعی عاری نہیں ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''ان حقائق کی موجودگی میں کسی کا یہ کہنا کہ ذوق ترنم سے نا آشنا ہے یا اس کی غزلیں موسیقیت سے عاری ہیں، کب معتبر ہوسکتا ہے؟''

(''ذوق اور علم موسیقی''، ماہنامہ نگار، ستمبر 1958، ص:39)

اسی طرح انصاراللہ نے ذوق کے فن موسیقی سے لگاؤ کو ثابت کرنے کے لیے ان کے کلام میں موجود بہت سے راگ راگنیوں اور سازوں کا حوالہ اپنے مضمون ''ذوق اور فن موسیقی'' میں پیش کیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر جہاں ایک طرف ذوق کی فن موسیقی سے لگاؤ کا پتہ چلتا ہے وہیں مضمون نگار کی فن موسیقی کی معلومات بھی پر حیرانی ہوتی ہے۔ مثلاً ذوق کا ایک شعر ہے۔

تا خراسان و عراق و زابل و نیریز سے
نغمہ ریز فارس آباد اس کرے اپنا مقام

بہت سارے لوگوں نے 'خراسان وعراق وزابل و نیریز' کو ملکوں کے نام تصور کر لیا جس کی وجہ سے وہ اشعار کا مطلب صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے۔ یہ سب موسیقی کی اصطلاحات ہیں، انصاراللہ نے اس کی معلومات دے کر اس شعر پر جو عمدہ بحث کی ہے وہ کافی طویل ہے، اس لیے بطور نمونہ ایک اقتباس کا کچھ حصہ میں یہاں پیش کرتی ہوں، آپ خود پڑھ کر ان کے فن موسیقی کی معلومات کا اندازہ لگائیے:

''زابل و نیریز وخراسان وعراق، یہ چاروں مقامات موسیقی ہیں۔ ''مقام'' اصطلاح میں ''پردۂ سرود'' کو کہتے ہیں۔ فارسی موسیقی میں کل 12 مقامات مقرر ہیں۔ یہ بارہ مقامات بارہ بروج فلکی کی مناسبت سے ہیں اور ان کی ترتیب اس طرح ہے:۔ اول رہاوی، دوم حسینی، سوم راست، چہارم حجاز، پنجم بزرگ، ششم کوچک، ہفتم عراق، ہشتم صفاہان، نہم نوا، دہم عشاق، یازدہم زنگلہ، دوازدہم بوسلیک۔ ہر مقام کے لیے دو گھنٹہ کا وقت مقرر ہے۔ اس طرح دن رات کے چوبیس گھنٹوں پر ان کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔''

(''ذوق اور فن موسیقی''، ماہنامہ نیا دور، ستمبر 1960، ص:25۔24)

مولانا محمد حسین آزاد نے شیخ ذوق کے متعلق لکھا ہے کہ ''نجوم ورمل کا بھی شوق کیا اور اس میں دست گاہ پیدا کی۔'' اور انھوں نے ہی آگے بتایا ہے کہ جب ایک صاحب کمال سے استاد ذوق نے سنا کہ ''ایک ستارہ کا حال اور اس کے خواص معلوم کرنے کے لیے 77 برس چاہیے ہیں'' تو اس

ے

(578:

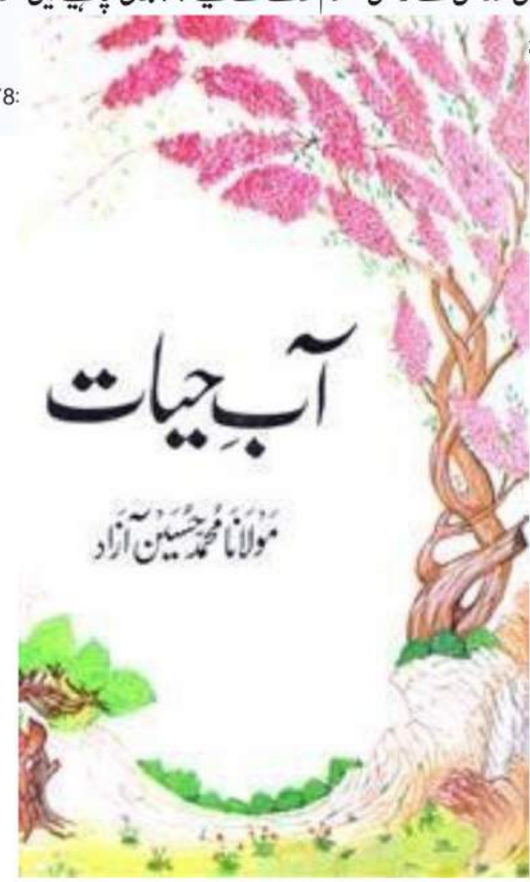

ذوق کے معاصرین میں صرف حکیم مومن خان مومن کو علم نجوم و رمل میں دست گاہ حاصل ہونے کی بات عرف عام میں مشہور ہے۔ ذوق کے متعلق یہ معلومات آزاد نے دی لیکن لوگوں نے اسے ان کی محبت پر محمول کیا اور توجہ نہ دی۔ انصاراللہ نے اس بیان کی تحقیق کی اور ذوق کے کلام سے اس سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی۔ اس بارے میں ان کا مضمون ''ذوق اور علم نجوم ورمل'' بہت اہمیت کا حامل ہے۔خود انصاراللہ کی اس علم سے واقفیت قابل تحسین ہے۔بطور نمونہ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اہل نجوم نے آسمان کو بارہ حصوں پر تقسیم کیا ہے اور ہر حصہ کو اصطلاح میں ایک ''برج'' کہتے ہیں، ہر برج کی شکل مختلف بتاتے ہیں اور اس کی شکل کی مناسبت ہی سے اس کو نام دیتے ہیں۔ان بارہ بروج کو عناصر اربعہ کی مناسبت سے چار قسموں میں ترتیب دیتے ہیں یعنی: اول، بروج آتشی۔ دوم، بروج خاکی۔ سوم، بروج بادی۔ چہارم، بروج آبی۔''

(''ذوق اور علم نجوم ورمل''، ماہنامہ نیادور، مارچ 1961ء ص32)

اپنی انھیں معلومات کی بنا پر وہ ذوق کی شاعری میں مستعمل علم نجوم ورمل کی باریکیوں اور اصطلاحوں کو نہ صرف ڈھونڈ ھ ڈھونڈھ کر پیش کرتے ہیں بلکہ ان پر سیر حاصل گفتگو بھی کرتے جاتے ہیں،اور مولانا آزاد کے اس قول کو کہ ''اگر رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے'' انصاراللہ بھرپور دلائل دے کر ثابت بھی کر دیتے ہیں۔ انصاراللہ نے ذوق کو فن طب کا بھی بڑا واقف کار بتایا ہے۔لہٰذا لکھتے ہیں:

''ذوق کے اشعار خود اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انھیں اس علم سے بہت کافی واقفیت تھی۔''

(''ذوق اور فن طب''، ماہنامہ نیادور، اکتوبر 1961ء ص8)

ذوق کو علم طب میں مہارت تھی لیکن انھوں نے کبھی طبابت نہیں کی کیوں کہ بقول آزاد انھیں خوف آتا تھا کہ بے پروائی میں کسی کا خون نہ ہو جائے۔اس سے ذہن میں یہ بات پیدا ہوسکتی ہے کہ کسی ماہر طبیب کو ایسا خوف کیوں کر ہوگا، لہٰذا ان میں ناپختگی رہی ہوگی لیکن اگر ایسا ہوتا تو ان کے طب کے استاد حکیم فیض علی اپنا علاج بھلا ان سے کیوں کرواتے؟ اس کے علاوہ کچھ واقعات کا ذکر بھی مذکورہ مضمون ''ذوق اور فن طب'' میں مذکور ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذوق طب کے اچھے جانکار تھے لیکن پیشہ اختیار کرنے کے بجائے اس علم کی اصطلاحات اور معلومات سے اپنے کلام کو بہرہ مند کیا کرتے تھے۔ انصاراللہ نے بجا فرمایا ہے:

''ذوق نے اس علم کو ذریعۂ معاش بنانے کی جگہ اسے علم و ادب اور زبان کی خدمت کا ایک وسیلہ بنایا۔ ذوق کی ایک صفت یہ ہے کہ انھوں نے ٹھوس علمی اصطلاحات اپنے اشعار میں اس طرح پیش کیے ہیں کہ شعر میں کسی ثقل کا احساس تک نہیں ہونے پاتا بلکہ اس میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ ایسے اشعار کا مطلب اور معنی سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ قاری بھی ان اصطلاحات سے واقف ہو۔ اگر وہ ان اصطلاحات کو نہیں سمجھتا تو شعر سے لطف نہیں اٹھا سکتا اور نہ اس کا مطلب اس کے ذہن نشین ہوسکتا ہے۔''

(''ذوق اور فن طب''، ماہنامہ نیادور، اکتوبر 1961ء ص:10-9)

یوں تو اس دور میں تمام شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین عام طور پر مل ہی جاتے ہیں، تو بھلا ذوق کا کلام اس سے مستثنیٰ کیسے رہ سکتا ہے، لہٰذا ان کے یہاں بھی بہ کثرت تصوف کے مضامین باندھے گئے ہیں، جیسا کہ انصاراللہ لکھتے ہیں:

''ذوق کے کلام میں تصوف پر نہ صرف کثرت سے اشعار ملتے ہیں بلکہ ان اشعار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو مسائل تصوف پر پورا عبور حاصل تھا۔''

(''ذوق اور علم تصوف''، ماہنامہ نیادور، اکتوبر 1962ء ص:34)

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف پر ذوق کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ تصوف کے اسرار و رموز اور اس کے پیچیدہ مسائل کی باریکیوں سے نہ صرف وہ واقفیت رکھتے تھے بلکہ اپنے اشعار میں بڑے سہل انداز میں پیش بھی کیا کرتے تھے۔ ان کے اس طرح کے متعدد اشعار انصاراللہ نے اپنے مضمون میں پیش کیا ہے، ساتھ ہی ان پر بھرپور مباحثہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

انصاراللہ کا ایک مضمون بعنوان ''ذوق کی کہانی۔ معاصرین کی زبانی'' ہے۔اس میں انھوں نے دس معاصر تذکرہ نویسوں کے یہاں ذوق کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اسے بڑی عمدگی سے نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ اس پر گراں قدر حواشی لگا کر علمی مباحثہ بھی قائم کیا ہے۔ اہل علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ حواشی لکھنے کے لیے کس قدر دقت نظری اور وسیع معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں برملا یہ کہنا چاہوں گی کہ انصاراللہ نے اس مضمون کی ترتیب و تدوین میں حواشی لکھ کر ایک اہم علمی و تحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے۔اس مضمون کے مطالعے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ذوق کے معاصرین ان کے اور ان کے کلام کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ وہ دس تذکرے جن سے ذوق کے متعلق معلومات پیش کی گئی ہے، ان نام یہ ہیں۔'یادگار شعرا'، 'مجموعۂ نغز'، 'ریاض الفصحا'، 'گلشن بے

خار'، 'گلشن بےخزاں'، 'آثار الصنادید'، 'سراپا سخن'، 'گلستان سخن'، 'یادگار دہلی'، 'سخن شعرا'۔ ان دس کتابوں کے انتخاب کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ذوق کا تذکرہ بس ان میں کیا گیا ہے، باقی کہیں نہیں ہے۔ بلکہ ایسا کرنے کے پیچھے ان کا مقصد اختصار کو ملحوظ خاطر رکھنا ہے۔ اس میں موجود ان کے حواشی پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مضمون نگار نے ذوق سے متعلق تمام بنیادی کتب کا عمیق مطالعہ کر رکھا ہے، ورنہ اس باریکی سے حواشی قلم بند کرنا آسان کام نہ تھا۔

کسی کے کلام میں الحاق کی تلاش بہت مشکل کام ہے لیکن انصار اللہ کو آسان کام پسند بھی کب ہوتا ہے، لہٰذا انھوں نے ذوق پر تحقیقی کام شروع کیا تو اس گوشے کو بھی تشنہ نہیں رہنے دیا اور ایک مضمون بعنوان "کلام ذوق میں الحاق" لکھ ڈالا۔ اس ضمن میں انھوں نے ان اشعار کی نشاندہی کی ہے جو اصلاً ذوق کے ہیں لیکن غلطی سے کسی اور کے نام سے بھی منسوب ہو گئے، اور ایسے اشعار کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے جو ہیں تو دوسرے شعرا کے لیکن غلط فہمی کے سبب ذوق کے نام مندرج کر لیے گئے۔ انصار اللہ نے اس سلسلے میں ذوق کے دیگر مرتبین سے زیادہ خود ان کے شاگرد آزاد کی گرفت کی ہے۔ اس مضمون کی بہت سی باتیں "دیوان ذوق۔ مرتبہ آزاد پر ایک نظر" میں آ چکی ہیں اس لیے تکرار کی صورت بھی نظر آتی ہے۔

ان کا ذوق پر لکھا ہوا ایک دوسرا مضمون "ذوق اور اقبال" کے عنوان سے ہے۔ اس کی طرف ان کا ذہن غالباً اس لیے گیا ہوگا کہ اقبال نے ابتدا میں اپنا کچھ کلام داغ کو اصلاح کی غرض سے دکھایا تھا اور یہ بات ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ داغ، ذوق کے ممتاز شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے کے علاوہ سید عابد علی عابد کا یہ قول بھی ان کے پیش نظر تھا کہ:

> "اقبال نے علوم شعری پر عبور حاصل کرنے کے لیے صرف داغ ہی کے کلام کا بہ غور مطالعہ نہیں کیا بلکہ جس دبستان شعر سے داغ کا تعلق تھا اس کے ممتاز ترین نمائندہ شعرا کا کلام بھی ان کے زیر مطالعہ تھا۔" (شعر اقبال، ص:130)

بس پھر کیا تھا انصار اللہ کے تحقیقی ذہن کے لیے اتنا سا سراغ کافی تھا۔ اس کے بعد وہ نکل پڑے۔ ذوق اور اقبال کا موازنہ کرنے اور ان میں مماثلت تلاش کرنے۔ پھر قصیدہ ہو کہ غزل، رباعی ہو کہ قطعہ و نظم، ہر اصناف سے انھوں نے ایسے اشعار پیش کر دیے جن میں اقبال کے یہاں ذوق کا رنگ و اثر دکھائی دیتا ہے۔ یہ اثر کہیں براہ راست ہے تو کہیں بالواسطہ۔ اس مضمون میں ان سب پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔

انصار اللہ کا ایک مضمون ہے "ذوق کا استاد کون تھا؟" اس میں انھوں نے معتبر حوالوں سے شاہ نصیر کو ذوق کا استاد بتایا ہے۔ ساتھ ہی آزاد کے اس قول پر کہ "ذوق نے ابتداً حافظ غلام رسول شوق سے مشورۂ سخن کیا" انصار اللہ نے اعتراض جتایا ہے۔ ان کے نزدیک اس وقت تک یہ بات قابل قبول نہیں جب تک کہ کوئی معتبر شہادت آزاد کی تائید میں نہ ملے۔ اس کے بعد قاضی عبدالودود صاحب کی جانب سے جب انھیں یہ لکھ کر آگاہ کیا گیا کہ:

> "اسپرنگر کی فہرست کے مطابق تذکرۂ سرور میں شوق کا شاگرد ہونا مرقوم ہے۔ تذکرۂ مذکور اس وقت پیش نظر نہیں لیکن مجھے یاد آتا ہے کہ اس میں ہے۔"

("حافظ غلام رسول شوق" ماہنامہ نگار، اپریل 1961، ص:20)

لہٰذا انصار اللہ نے اس کی تحقیق زور و شور سے کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ میں انھیں کچھ قابل قدر تذکرے مل گئے جس کی بنیاد پر انھوں نے ایک اور مضمون تحریر کیا جس کا عنوان تھا "حافظ غلام رسول شوق"۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنے قیاس کی توضیح بڑے عمدہ انداز میں کی ہے۔ اس میں انھوں نے لالہ سری رام، مرزا قادر بخش صابر، مرزا فرحت اللہ بیگ، میر محمد خان سرور، ڈاکٹر اسپرنگر اور رسا کے بیانات کی روشنی میں آزاد کے قول کی تائید پیش کرتے ہوئے حافظ غلام رسول شوق کو ذوق کا استاد تسلیم کر لیا ہے۔ حالاں کہ بس ابتدا میں ہی شاگردی کا معاملہ رہا ہے، لیکن چوں کہ شوق کو استاد کہلانے کا شوق تھا اور ذوق جو کہ بہت معروف بھی ہو گئے تھے انھیں اپنا شاگرد ہی بتایا کرتے تھے۔ ذوق چاہے انھیں استاد بتائیں یا نہ بتائیں۔

ذوق کثرت سے مطالعہ کیا کرتے تھے، تبھی تو اتنے علوم و فنون میں انھوں نے مہارت پیدا کر لی تھی۔ ان کے شوق کتب بینی کا بیان مولانا محمد حسین آزاد نے اس طرح کیا ہے:

> "حقہ منہ سے لگا رہتا تھا، کھری چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے، لکھے جاتے یا کتاب دیکھے جاتے۔"

(آب حیات، محمد حسین آزاد، احسان بک ڈپو لکھنؤ، ص:581)

مولانا آزاد کے اس بیان کو مدنظر رکھتے ہوئے محمد انصار اللہ کا تحقیقی ذہن یہ نتیجہ برآمد کرتا ہے کہ اس قدر پڑھنے لکھنے میں مستغرق رہنے والے شخص کی تمام عمر کی تصنیف یہی ایک مختصر دیوان نہیں ہو سکتا اور اسی نتیجہ کا پیش خیمہ ذوق پر لکھے ان کے یہ علمی و تحقیقی مضامین بنے۔ ان کے اس کام کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کیوں کہ اپنے ان مضامین کے ذریعے انھوں نے ذوق کی تصانیف اور ان کی معلومات کے سلسلے میں ہمارے علم میں اضافہ کیا ورنہ انھیں شاعر سمجھنے اور ان کے ایک دیوان کو

جاننے کے علاوہ ہمیں اور کیا ہی پتہ تھا۔ ہم دیوان ذوق کے علاوہ ان کی دیگر تصنیفات سے قطعی آگاہ نہیں تھے۔

انصاراللہ نے ان کے دیوان کے علاوہ جن تصنیفات کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک ''قصیدہ ہفدہ زبان'' ہے۔ ان کے مطابق اسے ذوق نے عالم شباب میں تکمیل علوم کے بعد تصنیف کیا۔ یہاں انصاراللہ نے ایک دلچسپ بات یہ بیان کی ہے کہ ان کی اسی تصنیف پر انھیں دربار دہلی سے ''خاقانی ہند'' کا خطاب عطا ہوا تھا۔ انصاراللہ نے ذوق کی غزلوں سے متعلق بھی ان کے ناتمام وست یابی کی بات ظاہر کی ہے، ان کا کہنا ہے:

> ''غزلوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے، دیوان مروجہ میں 222 مکمل غزلیں لکھی ہیں، 68 غزلیں ناتمام درج ہیں اور تقریباً 140 مطلع شامل ہیں، مختلف قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر مطلع مکمل غزلوں کے باقی ماندہ اشعار ہیں، ان کے علاوہ متعدد غزلوں اور مطلعوں کا علم قدیم تذکروں وغیرہ سے بھی ہوتا ہے جو موجودہ دیوان کی زینت نہ بن سکے۔''

(''ذوق کی تصانیف''، ماہنامہ نگار، جولائی 1958، ص:23)

انصاراللہ نے ذوق کے متعدد شعرائے اردو کے ایک ایسے تذکرے کی بھی جانکاری دی ہے، جسے اگر تلاش کرلیا جائے تو ان کے طرز انشا کا بھی علم ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ آزاد نے ان کے ''خلاصۂ دواوین'' کی بھی بات کہی ہے، بقول آزاد ''شیخ ذوق فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے تین سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور ان کا خلاصہ کیا۔'' انصاراللہ کا کہنا ہے کہ:

> ''ان کے علاوہ بھی ممکن ہے کہ ذوق نے کچھ لکھا ہو مگر ان کا اب کوئی ذکر بھی نہیں ملتا۔۔۔ چونکہ شہرت کی ہوس نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنی تصانیف کی اشاعت کی طرف توجہ نہ کی۔ ذوق نے شعر وادب کی بے لوث خدمت کی، ورنہ محض پیٹ پالنے کے لیے اور بھی کئی علوم وفنون تھے جن میں ان کو پوری مہارت تھی۔''

(''ذوق کی تصانیف''، ماہنامہ نگار، جولائی 1958، ص:24)

محمد انصاراللہ اپنے مضمون ''دیوان ذوق مرتبہ آزاد پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں کی محمد حسین آزاد نے دیوان ذوق کو مرتب کرتے ہوئے ذوق کے کلام جمع کرنے میں کماحقہ تلاش وتجسس سے کام نہیں لیا ہے۔ بہت سے دوسروں کے ایسے اشعار دیوان میں جمع کر دیے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر اور ناسخ کی غزلوں کا حوالہ دیتے ہوئے دلیل پیش کی ہیں۔ محمد انصاراللہ مزید لکھتے ہیں کہ دیوان میں ایسے کافی اشعار شامل نہیں کئے گئے جو محمد حسین آزاد کے علم میں تھے۔ اس سے پہلے آب حیات میں شامل کر چکے تھے۔ کئی تذکرے ان کے پیش نظر تھے۔ آسانی سے دستیاب بھی ہوتے پھر بھی انھوں نے بہت سے اشعار کو شامل نہیں کیا ہے۔ لہٰذا غلطی کے امکان زیادہ اس لیے ہوتے تھے کہ اس زمانے میں مطبوعہ مواد آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا تھا اور حافظہ کے بنا پر ایک شاعر کے شعر کو کسی دوسرے میں درج کر دیتے تھے۔ محمد انصار اللہ کے عمیق مطالعہ اور ان کے ذوق خواہش نے اشعار کے متن کی صحت کی ہے اور اپنی کوششوں سے ادبی تحقیق کو بلندی وقار عطا کیا ہے۔

اس کے علاوہ انصاراللہ نے اپنے مضامین میں یہ اطلاع بھی فراہم کی ہے کہ ان کے ایسے قطعات ور باعیات بھی بہت ہیں جو اب تک نہیں مل سکے ہیں۔ غالب کے خط سے ان کے دوسکوں کا ذکر ہے، ظاہر سی بات ہے کہ ذوق نے لکھا ہوگا تبھی وہاں مذکور ہے، لیکن یہ بھی اب تک حاصل نہیں ہوسکا ہے۔ آزاد نے ان کے ہزار ہا گیت، ٹھمری، ٹپے، ہولی اور سیٹھنیاں وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس کا بھی اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔ ان سب کے علاوہ انصاراللہ کے مطابق ذوق نے مخمس، مسدس، مثلث، مراثی، مثنوی، تاریخیں اور لوگوں کے سجع وغیرہ سب ہی کچھ کہا ہے لیکن یہ سارا قیمتی اثاثہ غدر کی نذر ہوگیا۔

انصاراللہ کو جہاں کہیں بھی ذوق کی کسی تصنیف کا پتہ چلا ہے، انھوں نے ذکر کردیا ہے لیکن اس پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرنے کے بجائے اس کی تحقیق وجستجو کی جانی چاہیے کہ آیا ایسا ہے بھی یا نہیں۔ کیوں کہ انصاراللہ کا زیادہ تر ماخذ آزاد کی آب حیات ہے اور آزاد پر اپنے استاد کی سائڈ لینے اور انھیں بڑا بنانے کا الزام لگ چکا ہے۔ اس لیے احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم مذکورہ تصانیف کو تلاش کریں یا کوئی ایسا معتبر ذریعہ سامنے لائیں جس سے یہ باتیں پایۂ ثبوت کو پہنچ جائیں۔

□□□

Sana Gazal
Research Scholar Urdu (BHU) Varanasi)
N13/14-3K Ansar Nagar
Nai Basti Saraisurjan
Bajardiha
Varanasi-221106 (U.P)
Mb-9369342152

میسرہ اختر

ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کے سماجی مسائل

اردو افسانوی ادب کی جب بھی بات کی جائے تو خواتین افسانہ نگاروں کی خدمات کو فراموش کرنا ناگزیر ہے۔ اردو میں افسانہ نگاری کے آغاز سے ہی خواتین افسانہ نگاروں نے افسانے کے میدان میں اپنے فن کے جوہر دکھائے اور مرد افسانہ نگاروں کے شانہ بشانہ نظر آتی رہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے جن افسانہ نگاروں کے نام ذہن میں آتے ہیں ان میں رشید جہاں سرفہرست ہیں جنھوں نے اپنی کاوشوں سے افسانوی ادب کا چراغ روشن کر کے خواتین کی نمائندگی کی۔ حالانکہ ان سے پہلے بھی افسانوی ادب میں خواتین نے اپنا جلوہ دکھایا مگر باقاعدہ آغاز رشید جہاں سے ہی ہوا۔ جنھوں نے اردو خواتین افسانہ نگاروں کی راہیں ہموار کی ہیں، وہ اپنی فنکاری کی وجہ سے اردو کی باوقار افسانہ نگار مانی جاتی ہیں۔ رشید جہاں سماج میں عورتوں پر ہو رہے ظلم و جبر، بے جا رسم رواج کے خلاف آواز اُٹھا کر اپنی تحریروں سے خاتمہ کر دیا۔ ان کا مقصد سماج کو آئینہ دکھانا اور کمزور اور مظلوم طبقہ بالخصوص استحصال زدہ خواتین کو ان کے واجب حقوق دلوانا تھا۔ قمر رئیس رشید جہاں کے متعلق اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کے افسانوں کی اہمیت کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اردو میں پہلی بار ایک انقلابی اور سائنسی ذہن رکھنے والی خاتون نے زندگی کو اس کے تاریخی اور مادی عوامل کے تناظر میں دیکھا۔ اس لئے ان کی نظر ان پہلوؤں پر بھی گئی جن پر نہ صرف مرد بلکہ خاتون افسانہ نگاروں کی بھی رسائی نہیں ہوسکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ہیرو کے بجائے ہیروئن کا کردار بھی نمایاں نظر آتا ہے"

(وہ اور دوسرے افسانے، از رشید جہاں، مکتبہ جامع لمیٹڈ دہلی، 1977، ص 24-25)

رشید جہاں کے افسانوں کا موضوع عورتوں کے مسائل ہی ہے، یہاں یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کے کئی افسانے جن میں عورتوں کا استحصال اور ظلم و جبر دکھایا گیا ہے مگر انھیں کے ان افسانوں کی عورتیں بہادر اور باہمّت بھی ہیں جو حق کی آواز بلند کرنے کی ہمّت بھی رکھتی ہیں۔ اس مشن کو آگے بڑھانے میں کئی نام آتے ہیں جن میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، رضیہ سجّاد ظہیر، خالدہ حسین، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو وغیرہ کے نام اہم تسلیم کیے جاتے ہیں مگر یہ بات بھی واضح رہے کہ عصمت اور عینی آپا تمام خواتین افسانہ نگاروں میں نمایاں نظر آتی ہیں، نظریاتی طور پر اگرچہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں مگر بنیادی مقصد ایک ہی ہے۔ وہ ہے سماج میں خواتین کو حق دلانا۔

اس طرح خواتین کا حلقہ اس قدر بڑھ گیا کہ ان کا نام لیے بغیر اردو

افسانوی ادب یا فکشن کی بات کرنا زیادتی ہے۔ان خواتین نے سیاسی و ثقافتی موضوعات کے ساتھ ساتھ عورتوں کے نفسیاتی و جذباتی مسائل کو بھی اپنے افسانوں کے موضوعات کا حصہ بنایا۔بیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں موضوعات کا تنوع نمایاں ہوا اور اپنے افسانوں میں چھوٹے چھوٹے مسائل جو روزمرہ زندگی میں پیش آتے تھے ان کو بھی شامل کیا۔اس طرح ان خواتین افسانہ نگاروں نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے نئے نئے مسائل کو موضوع بحث بنایا۔ابتدا میں خواتین افسانہ نگاروں نے خود کو خواتین کے مسائل ہی اجاگر کرنے تک محدود رکھا مگر وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے سماج کے دیگر مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور جس کی وجہ سے عوام ان مسائل اور حالات کے متعلق سوچنے پر مجبور ہوگئی۔

واجدہ تبسم معاصر خواتین افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں شامل ہیں۔انھوں نے عورتوں کے نفسیات کی سچی عکاسی کی ہے۔ان کے افسانے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں علم نفسیات سے خاصی دلچسپی ہے۔وہ نہ صرف عورتوں کی نفسیات کا احاطہ کرتی ہیں بلکہ ان کے افسانوں میں بچوں کی نفسیات کا بھی گہرا شعور ملتا ہے۔افسانہ "اُترن" میں دو معصوم بچیوں کے کرداروں کے ذریعے بچوں کی نفسیات کا احاطہ کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کا افسانہ "نتھ اُترائی، نتھ کا بوجھ، کیسے کاٹوں رات اندھیری، وغیرہ میں عورتوں کے مختلف مسائل نظر آتے ہیں۔

ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کی تحریروں میں اکثر و بیشتر یکسانیت کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ان کی اکثریت نے بعض عام مسائل و موضوعات جو سماجی، معاشی اور اقتصادی سطح پر رونما ہو رہے ہیں، اپنے افسانوں میں پیش کیے۔ہمعصر خواتین افسانہ نگاروں کے عام موضوعات و مسائل میں شامل شہری زندگی کے مسائل، کم ہوتی ہوئی اخلاقی اقدار، شوہر اور بیوی کے درمیان بڑھتی ہوئی دوریاں اور ان کی بے وفائیاں، نسوانیت کا نعرہ، نئی نسل سے مٹتی ہوئی تہذیب، فسادات، رسم پرستی کی تہذیبی صورت حال اور رشتوں کی شکست و ریخت یہ تمام موضوعات و مسائل ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔ان افسانوں میں حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے چاہے وہ کسی نظام کے خلاف ہو یا پھر کسی تحریک یا سماج کے خلاف ہو۔ان خواتین نے اپنی تحریروں کو نڈر ہو کر قارئین اور سماج کے سامنے پیش کیا۔ہمعصر خواتین افسانہ نگار نہ صرف ان موضوعات پر تفکر و تدبر سے کام لے رہی ہیں بلکہ ان پر افسانے تحریر کر کے ان مسائل سے قاری کو آگاہ کرنے میں اہم رول ادا کر رہی ہیں۔عالمی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں محسوس کیا جا سکتا ہے جہاں زندگی بھی ہے اور حالات سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔

> ''ہندوستانی معاشرت کے جارحانہ اور سخت گیر رویے عورت کی زندگی کے ہر اہم فیصلے پر اثر انداز ہوتے رہے۔لڑکی کو اپنی مرضی یا پسند کا حق حاصل نہ تھا۔اس کی پسند و ناپسند، محسوسات اور دوسرے فریق سے ذہنی ہم آہنگی کی پرواہ کیے بغیر بیٹیاں بوجھ کی طرح سر سے اتار دی جاتی تھیں۔خواتین افسانہ نگاروں نے اس حساس اور اہم موضوع پر قلم اٹھایا۔انھوں نے بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکی گئی لڑکیوں کے جذبات کی تصویر کشی عمدگی سے کی ہے.."

(اردو افسانے کی روایت اور پاکستانی خواتین افسانہ نگار تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، نورین رزاق، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور، 2005-2012، ص45)

ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے ذریعے فرسودہ رسم و رواج جس سے نوجوان لڑکیوں کو جبراً کوئی ایسا قدم اٹھانا پڑتا تھا جس سے ان کی زندگی جہنم بن جاتی تھی لیکن ان خواتین نے ایسے موضوعات اور زندگی کے ایسے مسائل کو اس طرح پیش کیا کہ فرسودہ رسم و رواج کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔اس مقالے میں ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں میں سب سے اہم ناموں کے متعلق سرسری بحث کی جائے گی۔

ذکیہ مشہدی اس فہرست میں ایک اہم نام ہے۔ذکیہ محتاط انداز کی افسانہ نگار ہیں اور ان کا بنیادی موضوع تہذیبی اور ثقافتی ہے۔ان کے افسانوں میں اخلاقی اقدار کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے، ہندو مسلم فسادات اور تقسیم ہند کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کے ملّی اور ثقافتی مسائل ان کی ترجیحات میں شامل ہیں۔انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ ہونے والی کشیدگی کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔"منظورروا" ان کا مشہور افسانہ ہے جس میں بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ اور اس کے سبب برپا ہوئے فسادات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔سیاسی اور تاریخی مسائل بھی ان کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔اس کے علاوہ روز مرہ زندگی کے مسائل، گھریلو مسائل، عورت مرد کے ڈگمگاتے کردار اور میاں بیوی کے درمیان بڑھتی ہوئی دوریاں جیسے سنجیدہ مسائل بھی ان کے افسانوں کے موضوعات بن گئے۔ان کے افسانے "قصہ جانکی رمن پانڈے" میں رمن کی دو بیویاں ہیں جس میں مسلمان بیوی تنہا رہنا پسند کرتی ہے مگر نہ ہی اس نے رمن پانڈے کو چھوڑا اور نہ ہی رمن نے اسے چھوڑا، بس وہ آزادی حاصل کرنا

چاہتی ہے اور اپنے چھوٹے سے گھر میں قید نہیں رہنا چاہتی۔ اسی طرح ان کا ایک اور افسانہ "ایک مکوڑے کی موت" پسماندہ قوم کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے، جس میں طنز آمیز لہجے میں موسیر اور ہری جنوں کے ایک خاندان کی بیان کی ہے۔ ذکیہ مشہدی کی معاشرے پر گہری نظر ہے، ان کو معاشرتی زندگی کے مختلف مسائل کو فنکاری کے ساتھ پیش کرنے میں مہارت حاصل ہے، معاشرتی حوالے سے ان کا ایک عمدہ افسانہ "تھکے ہوئے پاؤں" کے عنوان سے ہے جس میں افسانہ نگار نے دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک لڑکیوں کا جد و جہد کرنا اور پھر ماں باپ کا بیٹیوں کی شادی کے تئیں لاپرواہی برتنا۔ افسانہ نگار نے رتنا اور صوفیہ جیسے کرداروں کے ذریعے سماج کے اسی مسئلے کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے، جس کی مثالیں آج بھی ہمارے سماج میں مل جاتی ہیں:

> ''ذکیہ مشہدی کی تخلیقات میں بے شمار موضوعات ہونے کے باوجود ان میں تکرار نظر نہیں آتی۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری، تجربہ اور مشاہدہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ حقیقت نگاری کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے پریم چند کی روایت کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی سیاسی صورتحال، معاشی بے اطمینانی، مسلم گھرانوں کے مسائل اور مذہبی وملکی صورتحال کو بھی بطور موضوع پیش کیا گیا ہے"

(تحریک نسواں اور خواتین افسانہ نگار، ڈاکٹر تسنیم بانو، روشان پرنٹرز دہلی، 2022، ص280)

ان کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ افسانے میں بیان کی گئی چیزوں کا مختلف انداز سے تجزیہ کرتے ہیں، انھوں نے سماج کے زیادہ تر مسائل اور موضوعات کو اپنے افسانے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے جنھیں پڑھ کر قاری کے بھائی چارہ کا جذبہ جاگ اُٹھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے وہ افسانے جن میں ہمیں مختلف موضوعات ومسائل دیکھنے کو ملتے ہیں ان میں ماں، پارسا بی بی کا بگھار، ہدّو کا ہاتھی، بھیڑیے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ترنم ریاض اکیسویں صدی کی اہم خواتین افسانہ نگاروں میں شامل ہیں انھوں نے لڑکیوں اور عورتوں کے عصری مسائل کو انفرادی انداز میں اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ افسانہ "تعبیر" اس کی زندہ مثال ہے۔ ان کے افسانوں میں معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ فرد کی نفسیات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ترنم زندگی کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کرتی ہیں۔ ان کو انسانی رشتوں اور نازک احساسات وجذبات کو گرفت میں لینے اور مؤثر انداز سے پیش کرنے میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا افسانہ "ناخدا" جس میں عورت کی لاچاری اور بے بسی کے ساتھ ساتھ اس کی بیداری اور احساس زندگی کا عکس پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت کی کہانی ہے جسے شادی کے بعد شوہر سے ڈر کے رہنا پڑتا ہے۔ اس کا شوہر غرور اور اکڑ کے زعم میں مبتلا رہتا ہے کہ میں شوہر ہوں۔ اس کے اسی رویے سے اس کی بیوی بیمار ہو جاتی ہے۔ ترنم نے اسی طرح کی شادی شدہ لڑکیوں کی کہانیوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ "ہم تو ڈوبے ہیں صنم" ترنم ریاض کے اس افسانے میں شوہر اپنی بیوی کو ستاتا ہے اور اپنی بیوی 'نادیہ' پر طرح طرح کے الزامات لگاتا ہے۔ آخر میں اس کا شوہر بیمار ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی نادیہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی مگر شوہر اسپتال میں بھی اسے ذلیل کرتا ہے۔ جب نادیہ کا پیمانہ صبر سے لبریز ہو جاتا ہے تو وہ اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ ترنم ریاض نے افسانہ نگاری کو ایک نئی جہت سے روشناس کرانے کا کام کیا ہے۔ ان کے افسانے سیاسی اور سماجی مسائل سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ جن میں افسانہ "چمگادڑ" کافی اہم ہے۔ اس افسانے میں امریکہ کو شاطر اور ظالم کے طور پر پیش کر کے اپنی افسانہ نگاری کو نئے موضوعات سے آراستہ کیا ہے۔ "مٹی" افسانہ میں کشمیر کی سیاسی صورتحال کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کے علاوہ "یہ تنگ زمیں" کشمیر کے افسوسناک حالات کو مدنظر رکھ کر رقم کیا گیا ہے۔ اسی طرح "پورٹریٹ" افسانہ ساس بہو کی روایتی کھینچا تانی کو بیان کرتا ہے جبکہ افسانہ "گلچین" ایک بچے کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ 'پالنا'، 'آئینہ' اور کانچ کے پردے' ان کے دیگر اہم افسانے ہیں۔ ان کی تخلیقات کے بارے میں شبنم افروز لکھتی ہیں:

> ''ترنم ریاض وسیع فکر رکھنے والی افسانہ نگار خاتون ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں نئی بحث پیدا کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ سیاسی سماجی اور تہذیبی کہانیوں کے علاوہ جنسی کہانیاں لکھنے میں بھی انھیں قدرت حاصل ہے۔ میاں بیوی کے رشتے، نوکر مالک کے رشتے، ماں بیٹے کے رشتے، باپ اور بیٹے کے رشتے وغیرہ ان کے افسانوں میں تانیثی رجحان ومیلان کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔''

(ترنم ریاض کے افسانوں میں خواتین کے مسائل، شبنم افروز، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2019، ص28)

معاصر خواتین افسانہ نگاروں میں نگار عظیم بھی ایک اہم نام ہے۔ نگار عظیم کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر متوسط طبقے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ قدیم اور جدید نظریات کے پیچ پھلتے پھولتے رشتوں کو مرکز میں

رکھ کر ان کی تحاریر معنی خیز شکل اختیار کرتی ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جذبہ محبت، جدوجہد وجود اور عدم وجود اور اقتصادی عدم تحفظ ایسے مسائل ہیں جن سے عورت تو زیادہ ہی مگر مرد بھی کسی حد تک دوچار ہے اور دونوں ہی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ نگار عظیم نے اپنے دور کے معاملات ومسائل کو نہایت پختگی اور بالغ نظری کے ساتھ مشاہدہ کیا اور کشادہ دلی کے ساتھ سماج کے ان مسائل کو جدید نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔

''جرأت اظہار نگار عظیم کی بعض ایسی کہانیوں کا خاصا ہے جو نفسیاتی ژرف بینی کی آئینہ دار ہیں ان کے افسانے "فرق اور عکس" عورتوں کی نفسیات اور ان کی جنسی خواہشات کی پر اسرار کہانیاں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حقیقت نگاری میں اگر جرآت ساتھ دے جائے تو ایسی کہانیاں پھر شاہکار بن جاتی ہیں۔۔۔۔''

(ہم عصر خواتین افسانہ نگار: ایک جائزہ، ڈاکٹر شازیہ کمال، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2019، ص 128-129)

نگار عظیم جنسی جانب داری کا شکار نہیں، وہ عورتوں کی خرابیوں اور برائیوں پر سے بے باکی سے پردہ اٹھاتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ وہ جہاں رشتوں کی اعلیٰ اقدار کو موضوع تحریر بناتی ہیں وہیں اپنوں سے ملے دھوکے اور فریب کو سامنے لانے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ افسانہ "فرض" اس کی مثال ہے جہاں نیلوفر کے منگیتر سے اس کی سگی بہن اپنی بیٹی کی شادی کر دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جسے پڑھ کر یہ کہنے میں کوئی شرم نہیں محسوس ہونی چاہیے کہ نیلوفر کے ساتھ انسانیت کے نام پر کھلا دھوکہ ہوا کہ کیسے ایک عورت دوسری عورت کا استحصال کرنے پر اتر آتی ہے۔ اس کے علاوہ نگار عظیم کے افسانوں میں عورتوں کے دیگر گھریلو مسائل، ان کی پریشانیاں اور ازدواجی زندگی محرومیوں کا بیان ملتا ہے۔ کہانی "ایک معمہ" "مسز شرما کی ازدواجی زندگی کی محرومیت کا ایک نمونہ ہے۔ "وہ لڑکی" افسانہ میں غربت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ سماج کی سفاکیت سامنے آ جاتی ہے۔ "دوسرا قتل" افسانہ میں نگار عظیم نے عورت کی بے ایمانی اور بے وفائی کو پیش کیا ہے جس میں ایک عورت اپنے خاوند کا قتل کر کے دوسرے نوجوان مرد کو اپنے جال میں پھنسا لیتی ہے۔ افسانہ "تفتیش" میں ایک بیوہ ماں ایک پرائے مرد سے تعلقات رکھتی ہے اور جوان بیٹی کو بھی اس مرد کی ہوس کا شکار بننے میں مدد کرتی ہے۔ یہاں نگار نے عورت کی بدترین شکل دکھانے کی کوشش کی ہے جس کو رشتوں کا بھی لحاظ نہیں رہتا۔ نگار عظیم رشتوں کے تئیں زیادہ حساس ہیں مگر اس کے علاوہ بھی متعدد موضوعات ان کے ذہن میں آتے ہیں۔ نوجوانوں کو روزگار نہ ملنا اور عورت کی بدکرداری، خستہ حالی، ان کا استحصال، شادی بیاہ، جہیز کے مسائل، فرقہ وارنہ فسادات، انسانی تہذیب واقدار کی لوٹ کھسوٹ، عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ وغیرہ جیسے مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔

غزال ضیغم بھی عصری خواتین افسانہ نگاروں میں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمیں متوسط طبقہ کے لوگوں کی دکھ بھری کہانیاں دیکھنے کو ملتی ہیں اور ان کے کرداروں کی زندگی کی محرومیت کو جان کر قارئین کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ غزال ضیغم معاصر خواتین آوازوں میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کے یہاں کہیں کہیں تانیثی رجحان بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور ہندو مسلم تہذیب اور یگانگت کا خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ہجرت کا دردناک کرب، وطن کی یاد شوہر کی بے وفائی، ملک کے خراب ہوتے ہوئے حالات، رشتہ داروں کی آپسی رسہ کشی، لوگوں کے طرزِ زندگی میں آتی تبدیلی، عورت و مرد کے نفسیاتی پہلو، وغیرہ موضوعات ومسائل کو غزال ضیغم نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

''غزال ضیغم نے اپنے افسانوں میں انسانی رشتوں کو بھی جیا ہے، وہ رشتہ چاہے شوہر بیوی کا ہو یا بہن بھائیوں کا یا منہ بولے بھائی کا رشتہ وہ رشتوں کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں اور انہیں اپنے افسانوں میں سراہتی بھی ہیں۔''

(خواتین کے افسانوں میں عورتوں کے مسائل، فرزانہ شاہین، کلکتہ یونیورسٹی 2012، ص 179)

غزال ضیغم کے افسانوں کا محبوب استعارہ عورت ہے، ان کے افسانوں میں عورت کا روپ ہر طور پر نظر آتا ہے، افسانہ ''خوشبو'' میں ایک بہن، ماں کے روپ میں ہے اور اپنے بھائی کو ماں کی طرح پالتی ہے۔ افسانہ ''بے دروازے کا گھر'' میں عورت کفیل ہے جو دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنوں کی محبّت سے محروم ہے، اس کے علاوہ ان کے افسانے ''نیک پروین' 'انجیل پاک اندھیر پاک' مدھوبن میں رادھیکا' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غزال ضیغم نے عورتوں کے مسائل کو اپنے افسانوں میں خاص طور پر پیش کیا ہے جنہیں پڑھ کر قارئین بھی ان سے ہمدردی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھنے کے بعد قارئین کو ان کی اہمیت اور انفرادیت سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

ثروت خان کا نام بھی معاصر خواتین افسانہ نگاروں میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ثروت کے افسانوں میں زیادہ تر موضوعات سیاسی و سماجی ہوتے ہیں۔ میاں بیوی کے رشتوں کے درمیان کی کہانیاں بھی ان کے موضوعات کا حصہ ہیں۔ ان کا نظریہ بے حد وسیع ہے اور عورتوں سے

ہمدردی کا جذبہ ان کی تحریروں سے نمایاں ہے۔ثروت خان عورتوں کی نفسیات اوران کے ازدواجی مسائل پر بے حد سنجیدہ ہیں اورانھیں افسانوی پیرائے میں پرونے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔اس موضوع پر ان کا افسانہ "میں مرد مار بھلی" ہے جس کا مرکزی کردار کیرتی ہے۔ کیرتی نے بچپن میں اپنی ماں کواپنے باپ کے ہاتھوں پٹتے ہوئے دیکھا ہے اوراب وہ مردوں کے خلاف باغیانہ رجحان رکھتی ہے۔ان کے افسانوں کے بارے میں شاذیہ کمال لکھتی ہیں:

> ''افسانہ نگار کی کہانیاں سماجی معاشرتی اور سیاسی ہیں۔کہیں میاں بیوی کی ازدواجی زندگی کا معاملہ ہےتو کہیں ماں باپ اور پھران کے بیٹے بیٹیاں بہو وغیرہ ہیں،کہیں ممتا کا سمندر ہے تو کہیں راجستھانی کلچر کی مختلف شکلوں کا بیان،کہیں سیاسی راہنماؤں کی بدعنوانی کا ذکر ہےتو کہیں عورت کی خوف اعتمادی اورخودداری کی جامع تصویر کھینچی گئی ہے۔''

(ہم عصر خواتین افسانہ نگار:ایک جائزہ،ڈاکٹر شازیہ کمال، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، 2019,ص143)

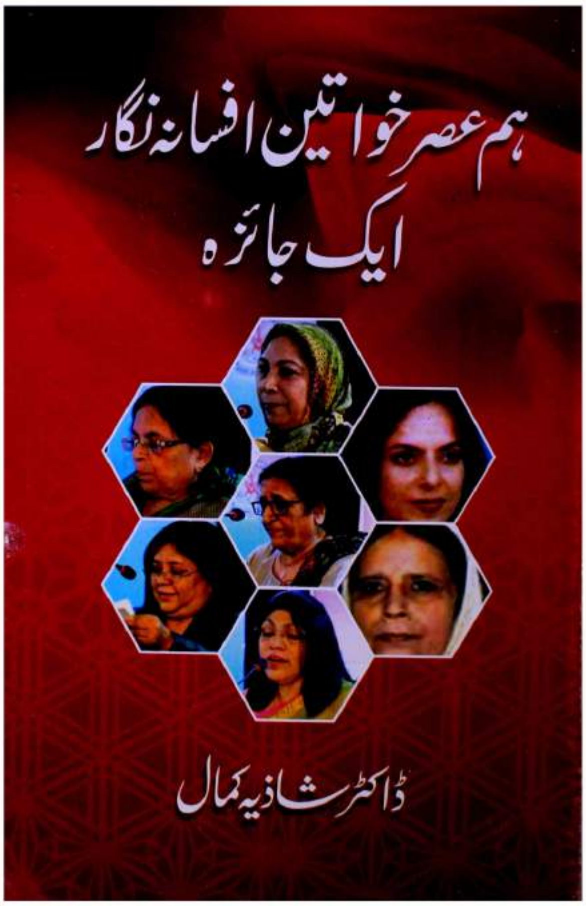

معاصر خواتین افسانہ نگاروں میں صادقہ نواب سحر کا نام بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ان کے افسانوں میں صنف نازک کے ساتھ ہورہے استحصال کو بیان کیا گیا ہے۔کم عمر لڑکیوں کی شادی کے برے اثرات اور عورتوں کی زبوں حالی ان کے افسانوں کے اہم موضوعات ہیں۔ان کا افسانہ "خدا دنیا بہت وسیع ہے"دل کو چھو لینے والا افسانہ ہے۔اس افسانے میں ایک عورت ہی دوسری عورت پرطرح طرح کے ظلم ڈھاتی ہے۔"خلش بے نام سی" بھی ان کا ایک عمدہ افسانہ ہے جس میں ازدواجی زندگی اور زچگی کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ان کا ایک اور افسانہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی '' لڑکیوں کی تعلیم اور فرسودہ خیالات پر مبنی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے شادی شدہ خواتین کی ذہنی کیفیت و احساسات کا تجزیہ بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

> ''جہاں لڑکیوں اورعورتوں کی تعلیم کے راستے ہموار ہوئے اور دوسری طرف وہ جاب اور روزگار بھی اختیار کرنے لگی۔لیکن یہی تعلیم اور روزگار کے لالچ میں جاہل لڑکے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرتے ہیں اوراگر وہ روزگار کرنا نہیں چاہتے تواس سے زبردستی جاب کروائی جاتی ہے"

(تحریک نسواں اورخواتین افسانہ نگار،ڈاکٹر تنیم بانو،ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی،2022، ص323)

ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے اورمشرقی سماج کے تقریباً زیادہ تر مسائل کی عکّاسی ان کے مسائل میں دیکھنے کوملتی ہے ۔ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست بہرحال بہت طویل ہے اور اس مختصر سے مقالے میں ان سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔متذکرہ بالا خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ بھی چند خواتین افسانہ نگاروں نے قارئین کواور ناقدین کومتاثر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے جن میں شائستہ فاخری،قمر جہاں،مسرور جہاں،خدیجہ مستور،ڈاکٹر اشرف جہاں،فاطمہ حسن،جمیلہ ہاشمی،اختر جمال،تبسم فاطمہ،کشور سلطانہ اورصبیحہ انور قابل ذکر ہیں۔

□□□

Myserah Akhter
Research Scholar
Bandgam
Tehsil Magam
Distt. Budgam-191111 (J&K)
Mob: +91-6005705255

ڈاکٹر قدسیہ انجم علیگ

غزلیں

جانے والے کو یہ پتہ ہی نہیں
زخم ایسا تھا جو بھرا ہی نہیں

کیا خبر تجھ کو روٹھنے والے
چاک دلِ پھر کبھی سلا ہی نہیں

برسوں تیرے بغیر بیت گئے
اب مجھے تجھ سے کچھ گلا ہی نہیں

ہم یہاں جان سے گزر بھی گئے
ان کے نزدیک کچھ ہوا ہی نہیں

وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے گا
اس نے جاتے ہوئے کہا ہی نہیں

اس نے کیسے سمجھ لیا سب کچھ
میں نے اس سے تو کچھ کہا ہی نہیں

یوں ملا کل وہ مجھ سے اے انجم
جیسے مجھ کو وہ جانتا ہی نہیں

تم نے دل ہی توڑ دیا کیا باقی ہے
یا کچھ اب بھی کہنا سننا باقی ہے

چھوڑ کے جاؤ ہمیں ستاؤ تم پھر بھی
یاد نہ آؤ بس یہ کہنا باقی ہے

دے چکے تھے دل اپنا برسوں پہلے
بس اب تو جان ہی دینا باقی ہے

تم نے جو لکھا تھا پیار کے رنگوں سے
خط وہ تمھارا برسوں پرانا باقی ہے

جن راہوں پہ ساتھ چلے تھے ہم اکثر
ان رستوں کی منزل پانا باقی ہے

تم نے ساتھ نبھانے کے وعدے تو کیے
لیکن ان وعدوں کو نبھانا باقی ہے

وہ جو پڑا ہے ایک ادھورا افسانہ
آؤ اس کو پورا کرنا باقی ہے

تیرے دل کی بات تو ہم نے سن لی ہے
اب اس بات پہ پھول چڑھانا باقی ہے

انجم کے خوابوں میں اکثر آتے ہو
اس کے گھر پر آنا جانا باقی ہے

Qudsia Anjum
70/11, Pakka Bagh
Saharanpur (U.P)
9837378699/8218902778

نظمیں

ذاکرہ شبنم

''مجھے جینا ہے''

مجھے جینا ہے
سندر سپنوں کو
آنکھوں میں سجائے
اُس کی یادوں کو
سینے سے لگائے
مجھے جینا ہے
معصوم تمنّاؤں کو
دل میں دفنائے
اُس کے دیدار کی چاہت کے بغیر
اس کی رفاقت کے بغیر
مجھے جینا ہے
مقدر کو گلے لگائے
من کو سمجھائے
یوں ہی اپنی پلکوں پہ
اُمید کے دیے جلائے
مجھے جینا ہے...!!!

''سوکھا گلاب''

بعد مدت میں نے کھولی
اک پُرانی سی کتاب
جس کے پنّوں میں ملا
مجھ کو اک سوکھا گلاب
اور
دیکھ کر اس کو
مجھے یوں لگا کہ
یہ نہیں ہے پھول
گویا میں ہوں اور میرا وجود
اِس سوکھے ہوئے گُل میں
یہی لگتا ہے مجھ کو
اب بھی گزرے موسموں کی
بھینی بھینی میٹھی خوشبو
رچی ہوئی ہے
بسی ہوئی ہے....!!!

Zakira Shabnam
C/O-Riyaz Ahmad
R-S- Foot Wear
Shop -No-192 , M-G Market
Robertsonpet-K-G-F
Dist. Kolar-563122 (Karnataka)
Mob:9916969954

شکیلہ نگار

دو آنکھیں

کمرے میں داخل ہوتے ہی ندیم بستر پر دراز ہو گیا۔اس نے جوتے تک نہیں کھولے بس ٹانگیں بستر سے نیچے لٹکا لی تھی۔انور بالٹی ہاتھ میں لیے اندر آیا۔غالباً وہ نہا کر آ رہا تھا۔ندیم کو اس طرح بستر پر دراز دیکھ کر پوچھا۔۔۔ندیم تم کب آئے؟ یوں ٹانگیں لٹکائے کیوں پڑے ہو؟ ندیم کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر وہ ندیم کے قریب آتے ہوئے بولا۔۔۔کیا ہوا ہے تم کو؟ اس طرح کیوں پڑے ہو؟

ندیم نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔۔۔کیا بتاؤں میرے یار۔۔۔کیا تھیں وہ آنکھیں۔۔۔اپنی زندگی میں میں نے ویسی آنکھیں پہلے کبھی نہیں دیکھیں۔۔۔بڑی بڑی نشیلی آنکھیں نہیں تھیں وہ۔۔۔نہ ہی کجراری تھیں۔۔۔نہ بھوری۔۔۔نہ ہری۔۔۔مگر غضب کی تھیں۔خدارا میں نے ایسی آنکھیں پہلے کبھی نہیں دیکھیں ۔۔۔میں کیا بتاؤں ؟ کیا تھیں وہ آنکھیں۔۔۔بس اتنا سمجھ لو غضب کی پر کشش تھیں وہ آنکھیں۔

یار !تم کہاں سے آ رہے ہو؟ کس سے ملے ہو؟ یہ کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ آنکھیں۔۔۔آنکھیں۔۔۔خدا جانے کون سی آنکھیں دیکھ کر آ رہے ہو؟ تم نہیں سمجھ سکتے میرے دوست !تم نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ان آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔۔۔کیا کچھ نہیں تھا ان آنکھوں میں۔۔۔ہاں تو بتاؤ نا ایسا کیا تھا ان آنکھوں میں؟ بس پہیلی بجھائے جا رہے ہو۔

تھوڑی دیر ان آنکھوں میں ڈوبا رہنے دو مجھے۔۔۔بس ڈوبا رہنے دو۔۔۔کچھ مت پوچھو میرے یار۔۔۔کچھ مت پوچھو۔۔۔۔کہتے ہوئے ندیم نے پاس پڑے ہوئے تکیے کو سینے پر رکھتے ہوئے زور سے دونوں

ہاتھوں سے دبا دیا۔انور نے آنکھیں بند کیے ندیم کو غور سے دیکھا۔زیرلب مسکرایا۔۔۔صحیح ہے میرے یار صحیح ہے۔۔۔لگتا ہے آج کسی حسینہ کی کجراری آنکھوں سے گھائل ہوکر آرہے ہو۔۔۔تم ڈوبے رہو ان آنکھوں کی مستی میں۔۔میں تو چلا۔۔۔کہتے ہوئے انور کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام کو جب لوٹا تو ندیم کو اسی طرح بستر پر دراز پایا۔اتنے گھنٹوں میں بس اس نے اپنے دونوں پیر جوتے سمیت بستر پر رکھ لیے تھے۔انور نے بیگ ٹیبل پر رکھا۔ریک پر رکھی بوتل اٹھا کر پانی پیا اور ندیم کے بیڈ کے قریب گیا۔اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔اب تک سو رہے ہو؟

ندیم نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔انور کی طرف دیکھا، مگر کچھ کہا نہیں۔ندیم کے خاموش رہنے پر انور نے اپنا سوال پھر دھرایا۔۔۔تم ٹھیک تو ہو؟ ابھی تک سو رہے ہو؟ جوتے تک نہیں اتارے؟ ہاں میں ٹھیک ہوں ندیم نے آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔اگلے ہی پل اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔کروٹ بدلی اور من ہی من بڑبڑایا۔۔۔انور میرے دوست! وہ آنکھیں۔۔۔وہ دو آنکھیں۔۔۔ندیم ابھی کچھ اور کہہ پاتا اس سے قبل انور نے اسے درمیان میں ہی روک دیا۔یار! یہ کیا دو آنکھیں۔۔۔دو آنکھیں کی رٹ لگا رکھی ہے تم نے۔تین بجے سے بستر پر پڑے ہو اور اب سات بجنے والے ہیں۔چلو اٹھو۔باہر چل کر چائے پیتے ہیں۔کہتے ہوئے انور نے زبردستی ندیم کو بستر سے اٹھا دیا۔

ڈھابے پر چائے پیتے ہوئے انور نے شدت سے محسوس کیا کہ ندیم نہ صرف خاموش ہے بلکہ وہ پوری طرح کہیں اور کھویا ہوا بھی ہے۔چہرے سے بے قرار دل کی کیفیت صاف طور پر نمایاں ہے۔انور چائے کی مختصر گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے بڑے ہی نرم انداز میں محو گفتگو ہوا۔۔۔ندیم! یہ سب کب سے چل رہا ہے؟ پہلے کبھی کچھ بتایا نہیں؟ یار! میں کیا بتاتا جب پہلے ایسا کچھ تھا ہی نہیں۔ندیم نے اپنے ہونٹوں کو گول گھماتے ہوئے کہا۔۔۔اوہ! تو یہ سلسلہ آج ہی شروع ہوا ہے۔ہمیں بھی تو پتا چلے کون ہے وہ حسینہ جس نے میرے یار کو اس قدر بے قرار کر رکھا ہے؟

ندیم نے ایک لمحے کے لیے دور خلا میں نظریں گھمائیں اور کہا۔۔یہی تو نہیں پتا۔۔۔بلکہ مجھے تو کچھ بھی نہیں پتا۔۔۔انور نے ندیم کا جملہ دوہرایا۔۔۔یہی تو نہیں پتا، کیا مطلب؟ کچھ تو جانتا ہوگا۔۔۔تیری کلاس میٹ ہے، سینئر ہے، جونیئر ہے، کون ہے آخر؟ ندیم نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔۔۔یار! مجھے سوائے اس کی آنکھوں کے کچھ نہیں پتا۔۔۔کون ہے؟ کہاں سے آئی تھی؟ کیا نام ہے؟ کچھ بھی تو نہیں معلوم! بس اس کی وہ دو آنکھیں۔۔۔غضب کی تھیں انور۔۔۔میں تمھیں کیا بتاؤں؟ بے حد پر کشش آنکھیں تھیں وہ۔۔۔ایک نظر میں ہی ان دو آنکھوں نے مجھے اپنا اسیر بنالیا۔۔۔میں پوری طرح ان آنکھوں کے سحر میں گرفتار ہوں۔

حد ہوگئی۔عجیب داستان ہے تمھارے عشق کی۔انور نے بھنویں سکوڑتے ہوئے کہا۔یار میں بے حد پریشان ہوں اور تم کو مذاق سوجھ رہا ہے۔میں مذاق نہیں کر رہا، حیرت کا اظہار کر رہا ہوں۔کچھ تو پتا چلے۔۔۔کہاں دیکھا؟ کب دیکھا؟ کیسے دیکھا؟ بتاتا ہوں میرے دوست سب بتاتا ہوں کہتے ہوئے ندیم نے ایک گہری سانس لی اور مدھم لہجے میں کہنا شروع کیا۔۔۔اتفاق! بس ایک اتفاق کہہ لو۔۔۔ان آنکھوں کا دیکھنا محض ایک اتفاق سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ہوا یوں کہ کل میں کلاس سے چلا آرہا تھا اچانک ترپاٹھی میڈم سے سامنا ہوگیا۔وہ بی۔ایڈ سپیشل والی ترپاٹھی میڈم۔ان کے ڈپارٹمنٹ کا کوئی پروگرام تھا۔وہ سیمینار ہال کی طرف جا رہی تھیں۔مجھے بھی چلنے کے لیے کہا۔میں کیسے انکار کرتا؟ مجبوراً جانا پڑا۔

سیمینار ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔سامنے ڈائس پر ہمارے ہی ایج گروپ کی میڈم بینائی سے محروم طلباء کو ان کے لیے بنائے گئے ایک خاص کمپیوٹر اپلیکیشن کی مدد سے کمپیوٹر کے استعمال کا ڈیمو دے رہی تھیں۔کسی طرح جگہ بنا کر میں بھی لوگوں کی بھیڑ میں بیٹھ گیا۔ابھی ٹھیک سے سانس بھی نہیں لی تھی کہ ڈائس پر موجود میڈم کی نظر مجھ سے ٹکرائی اور اس ایک لمحے میں ان دو آنکھوں کے سحر میں اس طرح قید ہوگیا کہ پھر مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔خدا کی قسم مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔سچ کہہ رہا ہوں انور مجھے ان دو آنکھوں کے علاوہ کچھ بھی یاد نہیں۔

انور! میں نے اب تک کی اپنی زندگی میں ہزاروں لڑکیاں دیکھیں۔کتنوں سے میری قریبی دوستی بھی رہی، مگر کسی کی آنکھوں میں وہ بات نہیں۔وہ کچھ الگ ہی طرح کی آنکھیں تھیں۔بہت ہی الگ۔خدا نے جیسے ان دو آنکھوں کو ایک خاص کاریگری سے بنایا ہے۔میں نہیں کہتا کہ بہت خوبصورت ہیں وہ دو آنکھیں، مگر ان میں کشش ضرور ہے۔ایک خاص طرح کی کشش۔کہتے ہوئے انور کا لہجہ جذباتی ہوگیا۔

ندیم نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے غور سے ندیم کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔۔۔یار ندیم! تو زیادہ پریشان نہ ہو۔اس طرح کے Infatuation ہوتے رہتے ہیں۔کبھی کسی کو کسی کی نشیلی آنکھیں، کسی کی ناگن زلفیں، کسی کے گلابی ہونٹ، کسی کے سرخ رخسار، کسی کی سریلی آواز، کسی کی کھنکتی ہنسی پسند آجاتی ہے۔ایک بار تو لگتا ہے ان کے بغیر ہماری زندگی میں کوئی رنگ نہیں، کوئی ساز نہیں، مگر پھر کسی کو کچھ یاد نہیں

رہتا۔ یہ چند دنوں کا ذہنی خرافات ہے۔ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔

مگر ایسا نہ ہوا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ندیم کی بے قراری بڑھتی چلی گئی۔ دو ہفتے گزر گئے تھے اور ندیم اب بھی ان دو آنکھوں کے حصار میں مقید تھا۔ آج صبح سے ہی مسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ انور لاکھ چاہ کر بھی لیب نہیں جا سکا تھا۔ ندیم بھی روم پر ہی تھا۔ مسلسل بارش کے سبب انٹرنیٹ کنیکشن بھی ٹھپ تھا۔ دونوں اپنے اپنے بستر پر چادر میں منہ ڈھانپے پڑے تھے۔ دو پہر کے دو بج رہے تھے اور دونوں بنا کھائے پیئے بستر پر دراز تھے۔ بھوکے پیٹ نیند بھی کہاں آتی ہے۔ بالآخر انور نے چادر کو تن سے الگ کرتے ہوئے کہا۔۔۔ یار ندیم! چل اٹھ اب۔ صبح سے روم میں منحوسیت پھیلا رکھی ہے ہم نے۔ یہ بارش تو آج رکے گی نہیں۔ چل روم پر ہی میگی بناتے ہیں۔ کب تک بھوکے پیٹ بستر سے لگے رہیں گے؟ ندیم نے چادر میں منہ ڈھانپے کہا۔۔۔ یار مجھے بھوک نہیں ہے۔ تجھے جو بنانا ہے بنا کر کھا لے۔ اچھا! یہ کیا بات ہوئی کہ میں بنا لوں اور کھا لوں۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے روم پر اکیلے کچھ بنایا اور کھایا ہو کہتے ہوئے انور نے ایک جھٹکے سے ندیم کے تن سے چادر جدا کر دی۔

ندیم نے آہستہ سے اپنی بوجھل آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے حرارت ہے۔ انور نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ یار یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے۔ پچھلے دو ہفتوں سے دیکھ کر رہا ہوں وہ جو پرکشش آنکھوں کا چکر شروع ہوا ہے تو نے ہنسنا، مسکرانا یہاں تک کہ کھل کر بات کرنا بھی بند کر دیا ہے۔ یار یہ کیا کلاسکی عاشقوں والی حرکت کر رہا ہے۔ بس ایک بار دیکھا اور پھر ان آنکھوں کے حصار میں اس طرح قید ہوا کہ رہائی ممکن ہی نہیں ہو پا رہی۔ کیا فائدہ خود کو اس طرح اذیت دینے کا جبکہ تجھے یہ بھی نہیں پتا کہ وہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟

میں کیا کروں انور؟ میرا دل میرے ہی قابو میں نہیں رہا۔ یہ تو ان دو آنکھوں کا ایسا بسمل ہوا کہ اس کی تڑپ کا اندازہ تم لگا ہی نہیں سکتے۔ تم کیا اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے بس وہ دو آنکھیں میرے سامنے ہوتی ہیں۔ اس کی کشش ہر لمحہ مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مگر، بے بسی۔۔۔ ہائے بے بسی۔۔۔

کچھ دیر کے لیے انور خاموش رہا پھر کہنا شروع کیا۔۔۔ ندیم! تمھارے دل کی کیفیت، اس کی بے قراری، اس کی تڑپ کا اندازہ مجھے ہے، مگر پھر بھی میں یہی کہوں گا۔۔۔ تم اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کرو۔ خود کو باہر نکالو ان فضول کی چیزوں سے۔ یہ کام تمھیں خود ہی کرنا ہوگا کوئی بھی تمھاری مدد نہیں کر سکتا۔ خود ہی باہر نکلنا ہوگا۔ لوگ بڑے بڑے حادثوں سے، بڑی بڑی مصیبتوں، بڑے بڑے صدموں سے باہر نکل آتے ہیں۔ یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ بس تمھیں عہد کرنا ہوگا۔ اپنی ساری توجہ پھر سے پڑھائی پر مرکوز کرنی ہوگی۔

تمھیں کیا لگتا ہے میں نے کوشش نہیں کی ہے؟ کی ہے میرے دوست! بہت کوشش کی ہے۔ مگر ناکامی۔۔۔ ہائے ناکامی! تو پھر تم ہی بتاؤ کیا کرنا ہے؟ خود کو اسی طرح اذیت میں رکھنا ہے؟ انور نے قدرے جھنجھلاہٹ سے کہا۔ انور! میں ان آنکھوں کے بنا نہیں رہ سکتا۔ نہیں رہ سکتا میں۔ کچھ کرو انور! پلیز کچھ کرو۔ خدا کے لیے کچھ کرو۔

انور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ندیم کی کس طرح مدد کرے۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ ندیم کو جی کا روگ لگ گیا ہے اور وہ کافی سیریس ہے اس معاملے کو لے کر۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔۔۔ اچھا چلو کل بی ایڈ ڈپارٹمنٹ کا چکر لگاتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی راستہ نکل آئے۔ اب بستر چھوڑو۔ میگی اور چائے بناتے ہیں۔ اس رم جھم برسات میں گرما گرم میگی کے ساتھ ایک ایک کپ کڑک چائے ہو تو مزہ آ جائے۔

اگلے دن لیب سے لوٹتے ہی انور نے زور زور سے ندیم کو آواز دینا شروع کر دیا۔ ندیم۔۔۔ ندیم! ندیم جو بالکنی میں کھڑا اپنے ہی خیالوں میں گم تھا انور کے اس طرح آواز دینے پر ہڑبڑا کر اندر آ گیا۔ انور نے لپک کر اسے گلے لگا لیا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اس طرح گلے لگانے پر ندیم بوکھلا سا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے انور کو خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔۔۔ کیا ہوا ہے؟ لگتا ہے آج کچھ زیادہ ہی خوش ہو۔

انور نے چہکتے ہوئے کہا۔۔۔ خوش خبری تیرے لیے ہے میرے یار! میرے لیے؟؟؟ کہتے ہوئے ندیم کی آنکھوں میں زمانے بھر کی الجھن سمٹ آئی۔ انور پھر چہکا۔۔۔ ہاں یار! یہ خوش خبری تیرے لیے ہے۔ جن دو آنکھوں نے میرے یار کے دل کا قرار چھین لیا ہے مجھے ان دو بے حد پرکشش آنکھوں والی حسینہ کا سراغ مل گیا۔

خوشی کے مارے ندیم کی زبان جیسے گنگ ہو گئی۔ بمشکل اس کی زبان سے دو حرف پھوٹے۔۔۔ سچ؟؟؟ بالکل سچ۔۔۔ صدفی صد سچ۔۔ اپنے یار کے لیے جو یار کم اور عاشق زیادہ ہو گیا ہے، اتنا تو کرنا ہی تھا۔ انور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے آگے کہا۔۔۔ دراصل تیری قسمت اچھی ہے ندیم! ہوا یہ کہ میرا کلاس میٹ ہے ناراج۔ آج کینٹین میں ہماری ملاقات اس کے کزن سوربھ سے ہوئی۔ پتا چلا کہ وہ بی۔ ایڈ سپیشل کر رہا ہے۔ باتوں باتوں میں میں نے اس سے اس دن کے پروگرام کے بارے

میں پوچھ لیا۔ اس نے بھی پروگرام میں شرکت کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ مالویہ نگر میں کمپیوٹر ٹریننگ کا ایک ادارہ ہے۔ تیری دو پرکشش آنکھوں والی حسینہ اسی ادارے سے آئی تھی۔ اس کا نام نیلوفر ہے۔ وہ اس ادارے میں کمپیوٹر ٹریز ہے۔ بینائی سے محروم بچوں کو کمپیوٹر آپریٹنگ کی ٹریننگ دیتی ہے۔ اتنا کہہ کر انور نے رک کر اپنی سانس درست کی پھر آگے کہا۔۔۔۔ اتنی جانکاری تو میں نے جٹا دی۔ اب آگے کا کام تیرا ہے۔ اس ادارے میں جا۔ نیلوفر سے مل اور اسے اپنے دل کا حال بتا۔

ندیم کی آنکھوں میں خوشی کی چمک کے ساتھ ساتھ خوف کی ہلکی سی لہر ابھر آئی تھی۔ اس ملی جلی کیفیت کو محسوس کر کے انور نے کہا۔۔۔ اوئے پیارے! اب کیا ہوا؟ اب تو دو پرکشش آنکھوں کے دیدار کا وقت قریب آن پہنچا پھر یہ رونی صورت کیوں بنا رہا ہے؟ انور! جانے کیوں ایک انجانا سا خوف ستانے لگا ہے۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے ابھر رہے ہیں۔ اب یہ بزدل عاشقوں کی طرح خوف کھانا چھوڑو۔ اس ادارے تک پہنچنے کی ترکیب کرو۔ وہاں پہنچو اور دو پرکشش آنکھوں والی حسینہ کو اپنے دل کا حال کہہ ڈالو۔ ندیم نے پریشان کن لہجے میں کہا۔۔۔ انور! میں اکیلے وہاں کس طرح جاؤں گا؟ یار یہ بے عمل عاشقوں کی طرح فالتو کے وسوسے پالنا بند کرو۔ اب جو کرنا ہے تمھیں ہی کرنا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کیسے کرو گے اور اگر کچھ کرنے کی ہمت نہیں ہے تو چادر میں منہ چھپا کر دو پرکشش آنکھوں کا تصور کر کے کڑھتے رہو، مرتے رہو۔

اچھا ناراض تو مت ہو۔ بس تھوڑا ڈر لگ رہا ہے۔ تم ساتھ چلتے تو۔۔۔ ندیم نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ انور تلخ لہجے میں بول اٹھا۔۔۔ ہاں ضرور چلتا ہوں اور کہو تو تمھارے بدلے پرپوز بھی میں ہی کر دوں۔ انور چپ کرو۔ کچھ بھی واہیات بکنے لگتے ہو۔ سوچتے بھی نہیں کیا کہہ رہے ہو۔ ہاں میں نہیں سوچتا اور تم بس سوچا کرو، کچھ کرومت۔ چادر میں منہ چھپا کر روم میں منحوسیت پھیلانے سے زیادہ تم اور کچھ کر بھی نہیں سکتے، کہتے ہوئے انور روم سے باہر نکل گیا۔

رات کے کھانے پر انور خلاف معمول خاموش رہا۔ ندیم اس کی خاموشی کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا، مگر آس پاس کئی جان پہچان کے لڑکے کھانا کھا رہے تھے اس لیے ندیم نے بات کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ کھانا کھا کر ٹہلتے ہوئے جب دونوں ذرا سنسان سڑک پر نکل گئے تو ندیم نے اپنی سوالیہ نگاہوں سے انور کے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔۔۔ انور! صبح کی بات کو لے کر تم اب بھی ناراض ہو؟ ندیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس طرح خاموش رہا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ندیم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ اچھا تم ناراض مت ہو۔ میں جلد ہی جاؤں گا بلکہ کل ہی جاؤں گا۔ اوہ! بڑی مہربانی۔ انور نے بنا اس کی طرف دیکھے مختصر سا جواب دیا۔

اگلی صبح انور ذرا جلدی اٹھ گیا۔ نہا دھو کر تیار ہوا بلکہ آج اس نے خود کو سجانے سنوارنے میں اور دنوں سے زیادہ وقت لگایا۔ قدآدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر مختلف طرز سے اپنے بال سنوارے۔ کئی بار اپنے سراپا پر نظر ڈالی اور جب پوری طرح مطمئن ہو گیا تو انور جو ابھی تک سو رہا تھا اسے آواز دی۔ انور۔۔۔ انور۔۔۔ انور اٹھو۔ دس بج گئے ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ انور نے آنکھیں بند کیے کیے جواب دیا۔۔۔ یار مجھے ابھی سونے دے۔ لنچ کے بعد لیب جاؤں گا تو جا، مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ تو جا کہاں رہا ہے آج تو تیری کلاس نہیں ہوتی ہے کہتے ہوئے اس نے اپنی اداس آنکھوں سے ندیم کی طرف دیکھا۔ ندیم پر نظر پڑتے ہی جیسے اسے سو پاور کا کرنٹ لگ گیا۔ ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔ ارے یہ صبح صبح میرا شہزادہ جا کہاں رہا ہے؟ پھر خود ہی کہنے لگا۔۔۔ اپنی دو انتہائی پرکشش آنکھوں والی شہزادی کی تلاش میں۔ واہ بیٹا! واہ! جگ جگ جیو میرے لال۔۔۔ عشق کی گرمی نے آخر ہمت عطا کر ہی دی۔۔۔ صحیح کہا گیا ہے۔۔۔ ہمت مرداں مدد خدا۔۔۔ ٹھیک ہے اب جا۔۔۔ انگوٹھا اٹھا کر اس نے آل دی بیسٹ کہا اور پھر چادر میں منہ چھپا لیا۔

روم سے باہر آ کر ندیم سیدھے بلال کے ہوٹل گیا۔ ہوٹل میں بھیڑ نہ کے برابر تھی۔ اس نے قیمہ پوری آرڈر کیا اور ان دو پرکشش آنکھوں کے خیال میں گم ہو گیا، بہت جلد جس کا دیدار نصیب ہونے والا تھا۔ اس کے خیالوں کا تارتب ٹوٹا جب راجو، ہوٹل میں کام کرنے والا سولہ سترہ سال کا لڑکا آرڈر لیے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ناشتہ کر کے ندیم نے نیمبو والی چائے پی اور ای رکشہ لے کر اوکھلا میٹرو اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس وقت ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے۔ دفتر کا ٹائم ختم ہو چکا تھا اس لیے زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ جیسے ہی مالویہ نگر جانے والی میٹرو آئی وہ تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ راستے بھر اس کے اوپر خواب کی سی کیفیت طاری رہی۔

میٹرو کے مالویہ نگر پہنچنے کے اعلان نے اسے حقیقت کی دنیا میں لا پٹکا وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ انور کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچتے پہنچتے ایک بج گیا۔ عموماً ایک سے دو بجے کا ٹائم لنچ بریک کا ٹائم ہوتا ہے۔ ندیم نے سوچا وہ بریک کے بعد ہی جائے۔ لہٰذا وقت بتانے کے لیے کسی معقول سی جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ کئی ساری دکانوں کے سائن بورڈ سے ہوتے ہوئے اس کی نظر سڑک کے آخری کونے

پر موجود کینٹین کے بورڈ پر جا کر رک گئی۔

خالی کرسی پر بیٹھ کر اس نے کینٹین کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور محض ایک کپ چائے آرڈر کر دیا۔ جلد ہی پندرہ سے سولہ سال کا ایک لڑکا ٹیبل پر چائے رکھ کر چلا گیا۔ جیسے ہی اس نے چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگانا چاہا گرما گرم چائے کے ٹھیک درمیان میں وہی دو پرکشش آنکھیں مسکراتی ہوئی نظر آئیں۔ اس نے گھبرا کر کپ ٹیبل پر رکھ دیا اور لرزتے قدموں سے رفتہ رفتہ ادارے کی طرف بڑھ گیا۔

Reception پر نوجوان لڑکی شانے پر بال بکھرائے بیٹھی تھی۔ اس نے جی بھر کر لپسٹک لگے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے ندیم کا خیر مقدم کیا اور اپنے Professional Attitude کے ساتھ پوچھا۔۔۔ جی سر بتایئے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟

ندیم نے اپنی آئی۔ ڈی دکھاتے ہوئے کہا۔۔۔ میم میں جامعہ سے آیا ہوں۔ ابھی چند روز پہلے آپ کے ادارے سے نیلوفر میم کا ایک پروگرام تھا۔ مجھے ایک Assignment کے سلسلے میں نیلوفر میم سے ملنا ہے۔ لڑکی نے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔۔۔ ہاں یاد آیا کچھ دن پہلے نیلوفر میم کا ایک پروگرام تھا تو جامعہ میں۔ جی میم! مجھے اسی سلسلے میں نیلوفر میم سے ملنا ہے۔ لڑکی نے اپنے چہرے پر سنجیدگی کا رنگ لاتے ہوئے کہا۔۔۔ سوری سر! میم تو ابھی ابھی کلاس میں گئی ہیں۔ آپ کو wait کرنا پڑے گا۔ آپ چاہیں تو یہاں بیٹھ سکتے ہیں یا پھر آپ کو جو بہتر لگے۔ جی میں یہیں انتظار کر لوں گا کوئی مسئلہ نہیں۔ جی بہتر کہتے ہوئے لڑکی نے سامنے رکھے کمپیوٹر میں اپنی آنکھیں گڑا دیں۔

یوں تو ندیم خاموش بیٹھا تھا، مگر اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچی تھی۔ وہ اپنے تصور میں نیلوفر کے آڑے ترچھے نقوش بناتا اور پھر ان میں اچھی طرح سے جانی پہچانی دو آنکھوں کو فٹ کرنے کی کوشش کرتا مگر مناسب نہ جان کر ان نقوش کو مٹا ڈالتا۔ ابھی وہ اپنے اس لاحاصل عمل میں مصروف تھا کہ لڑکی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔۔۔ میڈم اپنے کیبن میں ہیں آپ ان سے مل سکتے ہیں۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے آگے کہا۔۔۔ یہاں سے Strait چل کر Left۔ تھینک یو کہتے ہوئے ندیم نے کیبن کی طرف قدم بڑھا دیا۔ اگلے ہی پل وہ نیلوفر یاسمین کا نیم پلیٹ لگے کیبن کے سامنے کھڑا تھا۔ شیشے کے دروازے پر ہلکے ہرے رنگ کا ریشمی پردہ لٹک رہا تھا۔

باہر دروازے پر رک کر ندیم نے زور زور سے دھڑکتے اپنے دل کی دھڑکنوں کو قابو میں کیا اور کانپتے ہاتھوں سے جیسے ہی دروازہ کھولا وہی دو پرکشش آنکھیں جس نے پچھلے پندرہ سولہ دنوں سے اسے اپنے حصار میں قید کر رکھا تھا، اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ ندیم نے ہمت کر کے پوچھا۔۔۔ مے آئی کم ان۔۔۔ یس کم ان۔۔۔ نیلوفر کی بے حد سنجیدہ مگر مدھر آواز ندیم کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ دبے قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ نیلوفر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ندیم نے بیٹھتے ہوئے نیلوفر کے سراپا پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ یہی کوئی پچیس چھبیس سال کی عمر رہی ہوگی۔ نیلوفر بہت خوبصورت نہیں تھی، مگر اس کے پورے وجود کو اس کی دو پرکشش آنکھیں الگ ہی طرح کی کشش عطا کرتی تھیں۔

نیلوفر نے اپنے دوپٹے سے میچ کرتی ہوئی ہلکے گلابی رنگ کی لپ سٹک لگے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ سجاتے ہوئے ندیم کے آنے کا مقصد دریافت کیا۔ مسکراتے ہی اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھے تھے جس نے ان آنکھوں کی کشش میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ ندیم نے آنے سے پہلے اچھی طرح ہوم ورک کر لیا تھا۔ بڑے آرام سے اس نے بتایا کہ میں بینائی سے معذور بچوں کی پڑھائی کا مسئلہ اور جدید ٹکنالوجی کے موضوع پر ریسرچ کرنا چاہتا ہوں اس سلسلے میں آپ کی معاونت درکار ہے۔ ندیم کے خاموش ہوتے ہی نیلوفر نے کہا۔۔۔ اچھا ٹاپک ہے۔ اس سلسلے میں کافی کچھ مواد تو آپ کو انٹرنیٹ سے ہی مل جائے گا۔ میرے پاس جو مٹریل ہے وہ میرے ای میل پر ہے۔ آپ اپنا ای میل آئی ڈی دے دیں میں آپ کو میل کر دوں گی۔ جی ضرور کہتے ہوئے ندیم نے جیسے ہی اپنے بیگ سے قلم نکالنے کے لیے بیگ ٹیبل پر رکھنا چاہا اس کا ہاتھ پاس رکھے گلدستے سے ٹکرایا اور چھناک کی آواز کے ساتھ کانچ کے ذرّے فرش پر بکھر گئے۔ کانچ کے بکھرنے کی آواز سنتے ہی نیلوفر کے چہرے پر خوف کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی اور وہ ٹیبل پر رکھے کال بیل کو ہاتھوں سے ٹٹولنے لگی۔ ندیم نے انتہائی حیرت سے یکبارگی کال بیل ٹٹولتے نیلوفر کے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اس کی دو انتہائی پرکشش آنکھوں میں، جو خلا میں جانے کہاں تک رہی تھیں۔ ندیم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ہکّا بکّا سا کیبن سے باہر نکل گیا!!!

□□□

Shakila Nigar

S.M.S.G College

Sherghati

Gaya-824211 (Bihar)

Mob: 7983432279

shakila84nigar@gmail.com

خودمختاری

محمودہ قریشی

شادی شادی شادی، کیا ہوتی ہے یہ شادی۔؟بس آپ کو اس کے علاوہ بھی کچھ دکھائی دیتا ہے، کتنی بار منع کیا ہے آپ اس موضوع کو زیر بحث نہ لایا کریں۔ گھن آتی ہے مجھے اس لفظ سے۔

پاگل ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جو شادی کر کے اپنی زندگی کو جہنم بنا لیتی ہیں۔ ان کی تمام صلاحتیں محدود ہو جاتی ہیں۔ اور ان کے مقدر میں صرف غلامی رہ جاتی ہے۔ میں خودمختار ہوں خود سے اپنا اور اپنے سے وابستہ افراد کا بھی پیٹ پال سکتی ہوں۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے شادی کی۔؟ شادی تو ان لڑکیوں کے لیے ضروری ہے جو خود اپنا بوجھ نہیں اٹھا سکتیں اس لیے مرد کا آسرا چاہتی ہیں۔ دراصل اصل فائدہ تو مرد کو ہوتا ہے۔ عورت کے لیے تو شادی کا مطلب چوبیس گھنٹے کی ملازمہ اور بچے پیدا کرنے کی مشین ہے۔ شادی کے بعد وہ مرد کے لیے صرف جسم رہ جاتی ہے۔ اس پر یہ وہ نو ماہ تک مرد کے بوجھ کو اٹھائے پھرتی ہے۔ جس میں اس کی خودمختاری کہاں گم ہو جاتی ہے۔ کچھ معلوم نہیں۔ اتنا ہی نہیں یہ عمل مرد اس کو بار بار دہرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔''

زینت ایک خوبصورت، ذہین اور بے باک لڑکی ہونے کے ساتھ نڈر اور سفاک بھی ہے۔ یہ صفت اس کی شخصیت کا منفرد پہلو اُجاگر کرتی

ہے۔کسی کی پرواہ کیے بغیر دلائل کے ساتھ اپنی بات پیش کرنا اسے خوب آتا ہے۔اپنی اسی منفرد شخصیت کے سبب وہ ہمیشہ گھر اور باہر موضوع بحث رہتی ہے۔پہلی ملاقات میں کوئی بھی اس کا قصیدہ خواہ بن جائے لیکن جب اس کے خیالات سے دوچار ہو تو اصل حقیقت واضح ہوجائے۔زینت اپنی خود مختاری کے سبب مغرور بھی سمجھی جاتی ہے۔لیکن زینت مغرور بالکل نہیں، صرف چڑتی ہے تو شادی اور جنسی رشتوں سے جب بھی کوئی دوست رشتہ دار یا اس کی امی اس موضوع پر بات کرتیں یا اسے شادی کرنے کے لیے سمجھاتی تو وہ چڑ جاتی ہے اور اس طرح کے الفاظ اس کی زبان سے نکلتے ہیں۔امی کو تو وہ کبھی نرمی کبھی سختی سے سمجھا دیتی ہے۔لیکن کسی اور کو صفائی دینا وہ ضروری بھی نہیں سمجھتی تھی۔

زینت متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جہاں شادی نہ کرنا عیب سمجھا جاتا ہے۔اس لیے یہ فکر زینت کی امی کو ہی نہیں بلکہ پورے خاندان کو تھی زینت کی امی کبھی اسے غصے سے تو کبھی پیار سے سمجھاتے ہوئے کہتی۔

''بیٹا، شادی تو قدرت کا نظام ہے۔اور نبی کی سنت اور خود عورت کا وجود شادی سے ہی مکمل ہوتا ہے۔تم میرا کتنا خیال رکھتی ہو دنیا سے میرے لیے لڑ جاتی ہو۔تو کیا تمھیں حق نہیں کہ تمھیں بھی یہ سکھ ملے۔؟

امی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے زینت کی تلخی کو سمجھا اور سر پر ہاتھ پھیرا اور محبت بھرا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا، میں جانتی ہوں میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔وہ پوری طرح سے خود مختار بھی ہے۔اچھا کماتی ہے۔پوری طرح سے اپنے پیروں پر کھڑی ہے۔لیکن میری بچی تجھے پوری زندگی گزارنے کے لیے ایک مرد کے سہارے کی ضرورت تو پڑے گی ہی؟''

ایک دم سے امی نے فکر مند لہجہ اختیار کرلیا اور کہا۔

''میری طرف بھی تو دیکھ بیٹا اس بڑھاپے میں تیرا کب تک خیال رکھ سکتی ہوں؟

مجھے تیری بہت فکر رہتی ہے میرے بعد تیرا کون خیال رکھے گا اور میں قبر میں کیا یہی فکر لے کر جاؤں گی۔؟ میری بیٹی کس کے سہارے رہے گی؟''

زینت نے امی کی ہمت کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر اپنے غصے پر قابو کرتے ہوئے کہا۔

''امی آپ مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جانے والی، بس آپ یہ خواہ مخواہ کی فکریں کرنا چھوڑ دیجیے۔

مرد صرف عورت کو سہارا دینے کے لیے ہی شادی نہیں کرتا بلکہ وہ... خیر......

''اور میں آپ سے پوچھتی ہوں امی، کیا کوئی مرد اپنی جنسی خواہشات کو چھوڑ کر صرف مجھے سہارا دینے کے لیے مجھ سے شادی کرسکتا ہے؟ صرف وہ میری روح سے محبت کرسکتا ہے؟''

امی زینت کی باتیں سن کر خاموش ہوگئیں۔اس کے اس اٹل فیصلے سے امی پوری طرح سے ٹوٹ چکیں تھی اور ایسی بکھری کہ پھر کبھی بستر سے نہ اٹھی۔زینت نے ان کی خدمت میں کوئی کمی نہیں رکھی اور ان کو بچانے کی ہر ممکن کوشش بھی کی۔لیکن اپنے فیصلے پر عمل پیرا رہی ماں کی بیماری بھی اسے اپنی رائے بدلنے پر مجبور نہیں کرسکی اور امی زینت کی شادی کا ارمان لے کر اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔یوں بھائیوں اور بھابھیوں کے ساتھ زینت کا رہنا دشوار ہوگیا تو وہ گھر چھوڑ کر اپنے فلیٹ میں چلی گئی تاکہ ہمیشہ سکون سے جی سکے۔ جہاں وہ ہمیشہ خود کو بے چین محسوس کرتی رہی۔دوست احباب صرف کام تک محدود رہتے۔وہ ترقی کرتے کرتے منیجر کی پوسٹ پر فائز ہوگئی لیکن قلبی سکون کو ہمیشہ ترستی رہی۔یہ غصہ وہ اپنی کام والی بائی پر نکال لیتی۔ایک روز زینت کا خلوص بھرا رویہ دیکھ کر کام والی مریم نے زینت سے کہا۔

''بی بی آپ میرے پر وجہ بلا وجہ غصہ ہوتی ہو اور ہر ایک چھوٹے سے چھوٹا کام کرانے کے لیے مجھ پر ہی تمھاری آنکھیں ٹکی رہتی ہیں۔میں آپ کا ہر ایک کام کرتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتی کہ آپ اس کا مجھے پیسہ نہیں دیتی بلکہ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ

آپ پڑھی لکھی ہو، اپنے پیروں پر کھڑی ہو۔

لیکن بی بی جی کچھ کمی زندگی میں صرف مرد ہی پوری کرسکتا ہے۔بی بی جی آپ برا نہ مانے تو آپ شادی کرلیجیے۔''

مریم کے منھ سے وہی الفاظ سن کر زینت کو پھر سے غصہ آ گیا لیکن زینت نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا تیرا مرد شراب پی کر گھر میں پڑا رہتا ہے اور تجھے کام پر بھیجتا ہے اور پھر بچوں کی ذمہ داری بھی تو ہی اٹھاتی ہے۔ اسکول کی فیس اور کھانے پینے اور کپڑے سے لے کر اسی لیے تو ایسا بول رہی ہے۔کیا یہی کمی پوری کرتا ہے مرد؟''

زینت کی باتیں سن کر مریم سہم گئی۔

اچھا بی بی جی میں چلتی ہوں کہہ کر مریم سیدھی اٹھ کر چلی گئی اور باہر جا کر پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔زینت کے اس طرح روز روز کے رویے سے مریم بھی کام چھوڑ کر چلی گئی اور دوسری کوئی بھی بائی آتی وہ بھی

زیادہ وقت نہیں ٹک پاتی۔اب زینت کو گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی اکثر خود ہی کرنے پڑتے۔آفس میں پوسٹ بڑھنے کے ساتھ ذمہ داری بھی بڑھ گئی تھی اور پھر گھر کے کام کے لیے کوئی ٹک نہیں پا رہا تھا۔اکیلے گھر اور آفس کی ذمہ داری اٹھاتے ہوئے وہ پوری طرح سے تھک چکی تھی لیکن اس نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔

ایک رات زینت کے پیٹ میں اس زور کا درد اٹھا کہ جس کو برداشت کر پانا زینت کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔زینت نے ڈاکٹر کو فون ملایا لیکن اس کا فون بند جا رہا تھا۔

زینت نے دوسرے ہی لمحہ اپنی خاص دوست فرح کو فون ملایا اس نے اتنی رات کو زینت کا فون دیکھ کر جلد فون ریسو کیا۔

''ہیلو زینت اتنی رات کو فون کیسے؟ کیا ہوا سب خیریت تو ہے؟''

فرح نے ایک ہی سانس میں کہا۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے فرح۔'' زینت نے درد بھری آواز میں جواب دیا۔

''کیوں کیا ہوا تجھے؟'' فرح نے پھر سوال کیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ میرے پیٹ میں کچھ دن سے ہلکا ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔میں نے کام کے سلسلے میں کچھ توجہ نہیں کی اب اچانک درد اتنا بڑھ گیا ہے کہ جس کو میرے لیے برداشت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔میں نے ڈاکٹر کو فون کیا لیکن ان کا فون بند جا رہا ہے تم پلیز کچھ کرو۔مجھ سے درد بالکل بھی برداشت نہیں ہو رہا ہے۔زینت نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

''زینت دیکھو میں سمجھ سکتی ہو لیکن مجھے اتنی رات کو تمھارے گھر چھوڑنے جانے کے لیے یہ کبھی راضی نہیں ہوں گے تمھارے فلیٹ کے قریب ہی ایک دوائی کی دکان ہے۔تم وہاں جا کر کوئی ٹیبلیٹ لے لو میں صبح تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلوں گی ابھی میں فون رکھتی ہوں یہ ناراض ہو رہے ہیں۔اچھا اپنا خیال رکھنا۔فرح کی باتیں سن کر زینت کو غصہ تو آیا لیکن یہ اس کی بھی مجبوری تھی۔''

زینت دیکھو میں سمجھ سکتی ہو لیکن مجھے اتنی رات کو تمھارے گھر چھوڑنے جانے کے لیے یہ کبھی راضی نہیں ہوں گے تمھارے فلیٹ کے قریب ہی ایک دوائی کی دکان ہے۔تم وہاں جا کر کوئی ٹیبلیٹ لے لو میں صبح تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلوں گی ابھی میں فون رکھتی ہوں یہ ناراض ہو رہے ہیں۔اچھا اپنا خیال رکھنا۔فرح کی باتیں سن کر زینت کو غصہ تو آیا لیکن یہ اس کی بھی مجبوری تھی۔

دوسرے ہی لمحہ زینت نے دوائی والے کو فون ملا دیا۔کسی نوجوان نے فون ریسو کرتے ہوئے کہا

''ہیلو کون؟''

زینت نے اپنا تعارف پیش کراتے ہوئے کہا۔

''ہیلو میں زینت بول رہی ہوں۔آپ کے میڈیسن اسٹور سے کچھ دوری پر میرا فلیٹ ہے۔مجھے اچانک پیٹ میں درد اٹھا ہے کیا کوئی میڈیسن مل سکتی؟ اور اگر بھیا میڈیسن میرے گھر تک پہنچا دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔میری حالت ایسی نہیں کہ میڈیسن لینے بھی آسکوں۔

دیکھیے میڈم۔اتنی رات میں ہمارے یہاں ہوم ڈیلوری نہیں دی جاتی ہے۔جیسا کہ آپ کہہ رہی ہیں آپ کا گھر کچھ ہی دوری پر ہے۔تو پڑوسی ہونے کے ناطے میں دکان کھول کر صرف آپ کو میڈیسن دے سکتا ہوں۔

آپ کسی کو بھیج کر منگوا لیجیے؟ زینت نے ضبط کرتے کہا۔

''بھیا کوئی نہیں ہے ہمارا آپ پلیز دیکھ لیجیے۔''

''میڈم سوری'' کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔

زینت پوری رات کروٹیں بدلتی رہی اسے کھڑے رہ کر نہ بیٹھے چین تھا۔

آٹھ بجتے ہی فرح دروازے پر نمودار تھی اور زینت کے پیٹ میں درد کی وجہ سن کر اسے ایک (Gynecologist) ماہر امراض نسواں، کے پاس لے کر گئی۔ڈاکٹر نے فوراً سارے چیک اپ کرانے کا مشورہ دیا اور زینت کو ہدایت کرتے ہوئے کہا یہ پریشانی جب تمھیں اتنے وقت سے ہے تو کیا ضرورت تھی تمھیں تکلیف کو بڑھانے کی اور تم تو خود پڑھی لکھی ہو۔اچھے سے جانتی ہو تکلیف کو بڑھانا نہیں چاہیے بلکہ اس کا علاج تلاش کرنا چاہیے۔

فرح نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب، پریشانی والی کوئی بات تو نہیں؟ زینت کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں۔

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

یہ دوائی میں لکھ رہی ہوں اسے بلا ناغہ لیتی رہیں۔اکثر لیڈیس کے ساتھ بھاری وزن اٹھانے کی وجہ سے یہ پروبلم ہو جاتی ہیں۔اس لیے

گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔ ہاں آئندہ اس بات کا خیال رکھیے گا کہ کبھی بھی بھاری وزن نہیں اٹھانا ہے۔''

زینت نے ڈاکٹر کے مطابق ساری باتوں پر عمل کیا اور دو روز میں ہی بہتر محسوس کرنے لگی اور جلد فرح کے ساتھ شاپنگ کا منصوبہ بھی بنا لیا تاکہ ذہنی طور بھی سکون محسوس کر سکے۔

تیار ہونے کے بعد گھر سے نکلتے وقت فرح کو فون ملایا اور کہا۔

''ہیلو فرح، تم نکل گئی گھر سے تمھیں اور کتنا وقت لگے گا؟''

''نہیں یار یہ، مجھے اپنے کسی دوست کے گھر لے کر جا رہے ہیں۔ میں تمھارے ساتھ نہیں چل سکتی۔ سوری یار میں نہیں جا سکتی۔'' فرح نے نادم ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''ایک کام کرو تم اکیلے ہی کیوں نہیں ہو آتیں؟'' زینت نے او کے کہتے ہوئے فون رکھ دیا۔

''اس پرسنلٹی کو دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ اس کو بھی کچھ پریشانی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کسی سے مدد کی اُمید رکھنا بھی بے کار تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اتنی چھوٹی سی بات بھی اتنا بڑا مسئلہ بن سکتا ہے۔وہ سامان چھوڑ کر باہر گئی اور اپنی ایکٹیوا سٹارٹ کی لیکن معلوم نہیں اکٹیوا کیوں اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی جب دیکھا تو پٹرول ختم ہو چکا تھا ، آس پاس کوئی پٹرول پمپ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔''

اور خود اکیلے ہی شاپنگ کے لیے مول کا رخ کیا وہاں پہنچ کر زینت نے اپنی ضروریات کی سبھی چیزیں خریدی اور بار بار پریشان نہ ہونا پڑے یہ سوچ کر راشن کا سامان بھی اپنی ٹرالی میں ڈال لیا اور کاؤنٹر پر جا کر پیمنٹ کرنے کے بعد جب سامان کا جائزہ لیا تو اتنا سارا سامان دیکھ کر یہ فکر پیدا ہوئی ڈھیر سارا سامان گھر تک کون لے کر جائے گا؟

سامنے کاؤنٹر پر جا کر سب سے پہلے اپنا ایڈریس کارڈ دکھاتے ہوئے زینت نے درخواست کی۔

''ہیلو میم یہ سامان اس ایڈریس پر پہنچانا ہے۔''

کاؤنٹر پر ہلکی سی پنک ٹی۔شرٹ اور کالی پینٹ میں نہایت ہی حسین، جمیل لڑکی بیٹھی ہوئی تھی اس نے مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''سوری میم ہمارا مول ابھی شروع ہوا ہے اسٹاف زیادہ نہیں ہے اور آج بہت سے لوگ چھٹی پر ہیں۔

ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے۔''

''ارے آپ کو ہوم ڈلوری کی سہولت تو رکھنی چاہیے۔'' زینت نے ہدایتی طور پر کہا۔ اب اس کی فکر دوبالا ہو گئی اس لیے وہ کبھی خود کو دیکھ رہی تھی اور کبھی سامان کا جائزہ لے رہی تھی کہ وہ کس طرح اس سامان کو گھر تک لے کر جائے گی۔؟ اس وقت اس کے سامنے یہ بہت بڑا مسئلہ تھا۔ چونکہ ڈاکٹر نے بھاری وزن اٹھانے کے لیے سختی سے منع کر رکھا تھا اور اگر وہ پھر سے بیمار ہو گئی تو کون اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جائے گا۔ یہ فکر اس پر الگ سے طاری تھی۔

اس پرسنلٹی کو دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ اس کو بھی کچھ پریشانی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کسی سے مدد کی اُمید رکھنا بھی بے کار تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اتنی چھوٹی سی بات بھی اتنا بڑا مسئلہ بن سکتا ہے۔ وہ سامان چھوڑ کر باہر گئی اور اپنی ایکٹیوا اسٹارٹ کی لیکن معلوم نہیں اکٹیوا کیوں اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی جب دیکھا تو پٹرول ختم ہو چکا تھا، آس پاس کوئی پٹرول پمپ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اووں شٹ، کہہ کر زینت اکٹیوا وہی کھڑی کر اندر جا کر ایک ایک تھیلا سامان باہر نکال کر رکھنے لگی۔ لیکن دور دور تک کوئی رکشہ، آٹو بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ بہت دیر کھڑی رہنے کے بعد کچھ آگے بڑھ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دور تک کا دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جون کی گرمی، اور دھوپ کی شدت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جون کی گرمی میں دھوپ کے قہر سے بچنے کے لیے سب دور کہیں جا کر چھپ گئے ہیں۔ لیکن زینت بھی کہاں ہار ماننے والی تھی آخر کار دور سے میلی سی صافی سر پر ڈالے ایک ضعیف رکشے والا دکھائی دیا قریب آتے ہی زینت نے اس سے بات کی مول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بابا وہاں سے سامان اٹھا کر گھر چھوڑنا ہے۔''

ٹھیک ہے بیٹا لیکن مجھ بوڑھے سے زیادہ سامان نہیں کھنچ سکے گا۔

ارے نہیں بابا میں بھی تو مدد کروں گی۔''

جیسے تیسے کر کے زینت اور رکشے والے نے سارا سامان رکشے میں لا دیا اور خود بھی رکشے میں دھکا لگانے لگی کبھی خود بھی رکشے پر سوار ہو جاتی لیکن ضعیف بزرگ رکشے والے کا خیال آتا تو نیچے اتر کر سامان میں دھکہ دینے لگتی اور یو گھر آ گیا وہ بزرگ رکشے والا اس کو گھر کے دروازے تک چھوڑ گیا۔لیکن اب زینت کے سامنے یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ چار منزل پر اتنے سارے سامان کو اوپر کون چڑھائے۔اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی کوئی شخص مل جائے جس کی مدد سے سامان کو اوپر تک لے جانے میں کچھ مدد مل سکے لیکن یہاں آج تک زینت نے کسی سے بات نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی کسی کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کی ہمیشہ اپنے میں گم رہنے والی کو آج ہمسائیوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔؟ ویسے بھی جون کی تپتی دوپہر میں اپنا آرام چھوڑ کر کوئی کیوں اس انجان لڑکی کی مدد کرنے کے لیے آ گے آئے گا۔آفس سے کسی سرونٹ کو بلانے کے لیے دل گوارہ نہیں کیا۔پتہ نہیں کوئی کیا سوچے گا کہ اپنے ذاتی کام بھی کرائے جا رہے ہیں-اپنے آپ کو کمزور پڑتا دیکھ خود کو سنبھالتے ہوئے زینت خود سے ہی گھسیٹ گھسیٹ کر سامان چار منزل تک لے گئی بار بار زینہ چڑھنے اور اترنے سے وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔بامشکل وہ سارا سامان دروازے تک لے آئی اور اس کے پیٹ میں درد شروع ہو چکا تھا۔وہ پانی پانی کرتے ہوئے وہی صوفے کے پاس ڈھیر ہو گئی۔لیکن گھر میں کوئی نہ ہونے کے سبب کسی نے بھی اس کی نہیں سنی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ ہاسپٹل کے بیڈ پر تھی۔

''یہ میں کہاں آ گئی؟''

کہہ کر اس نے خود سے اٹھنے کی کوشش کی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا نیچے کا حصہ تو ساتھ نہیں دے رہا۔

نرس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ارے ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو آپ کا آپریشن ہوا ہے۔اس طرح سے ابھی نہیں اٹھ سکتی ہے آپ۔''

آپریشن، آپریشن میرا آپریشن اور کس چیز کا آپریشن، مجھے یہاں کون لے کر آیا۔؟ اور کس نے کیا میرا آپریشن؟ پلیز مجھے کچھ بتاؤ میم

وہ دراصل آپ کو ایک رکشے والے نے ایڈمیٹ کرایا ہے۔

رکشے والے، رکشے والے کو میں کہاں ملی؟ زینت نے پھر سوال پیش کیا۔

آپ کے فیملی کے لوگوں کو بھی فون کر کے بلا لیا گیا تھا۔وہ سب باہر موجود ہیں۔ان کے دستخط بھی لیے گئے تھے۔''

''نرس نے ہدایت کرتے ہوئے کہا آئندہ سے خیال رکھئے گا بھاری وزن اٹھانے سے گریز کیا کریں۔''اچھا یہ انجکشن لیجیے پھر میں چلتی ہوں۔آپ پریشان نہ ہوئے میں آپ کے کسی فیملی ممبر کو بھیجتی ہوں اب آپ آرام کیجیے۔"

زینت زینت یہ سب کیا اور کیسے ہو گیا مجھے تو فون کرنا چاہیے تھا فرح روتی ہوئی ان الفاظ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔

لیکن زینت کچھ بھی حرکت نہیں کرتی ہے۔وہ ایک دم سے خاموشی اختیار کر گئی۔فرح زینت کا چہرہ دیکھ کر سمجھ گئی زینت کو گہرا صدمہ ہوا ہے اوپر سے یہ تکلیف۔

فرح نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''زینت تم زیادہ فکر نہیں کرنا۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ارے یہ پریشانی تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ہاں تم خود مختار ہو لیکن ہو تو ایک عورت ہی مرد تو نہیں۔؟

زینت نے کراہتی ہوئی آواز میں ہوں،۔۔۔کرتے ہوئے آہستہ سے 'امی.....' کہا۔اور اپنے آنسوؤں کو جذب کرتے ہوئے فرح سے مخاطب ہوئی۔

''فرح میں ایک بات کہوں؟''

وہ دراصل... میں۔

پھر زینت نے ہمت کر کے ایک ہی سانس میں کہا۔

کیا میری شادی ہو سکتی ہے۔؟

''کیا فرح تم میری شادی کرا سکتی ہو؟'' زینت نے سوالیہ نظروں سے فرح کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''امی صحیح کہتی تھیں عورت کتنا ہی خود مختار کیوں نہ ہو جائے اسے مرد کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔میں یہ بات آج اچھے سے سمجھ گئی ہوں کہ مرد کے بغیر زندگی بہت مشکل ہے۔''

فرح نے روتے ہوئے کہا۔

''بہت دیر سے سمجھ میں آیا زینت تیرے۔ہاں تو اب مکمل عورت بن سکتی ہے۔لیکن خود مختار ماں......نہیں۔''□□□

Mehmooda Qureshi
Research Scholar
Department of Urdu
Dehli University, Dehli-110007
Mob: 7417912943

رومانہ عفت راہی

آنگن کی تتلیاں

موسم برسات کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ ایک حسین سی شام تھی۔ پورے آسمان پہ اودے، نیلے، کالے بادلوں نے اپنا ڈیرہ جمالیا تھا۔ روح کو تازگی بخشنے والی ہواؤں کے ساتھ درخت، پودے اور پھول خوشی سے جھوم رہے تھے۔ پارک میں بہت گہما گہمی تھی، اس حسین سے موسم کو انجوائے کرنے کے لیے لوگ پارک میں آرہے تھے۔۔۔علی مرتضیٰ پارک میں ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے، اور ان کی نگاہیں دور گھاس پر بیٹھی ایک فیملی پہ تھی۔ دونٹ کھٹ شرارتی لڑکیوں کی شرارتیں عروج پر تھی۔ ان ٹین ایج لڑکیوں کی شرارتوں کو ان کے پیرنٹس بہت انجوائے کر رہے تھے اور ان کے لب مسکرا رہے تھے۔۔علی مرتضیٰ ایک دم بینچ سے اٹھے تھے، اور آگے بڑھے تھے۔ پورے پارک میں شوخ لڑکیاں تتلیوں کی طرح منڈ لاتی پھر رہی تھیں۔۔۔علی مرتضی کو اپنے آنگن کی تتلیاں اس وقت شدت سے یاد آرہی تھی، ان کی بیٹیاں، ان کے آنگن کی تتلیاں بھی تو ایسے حسین سے موسم کی بہت دیوانی تھیں۔

آسمان پہ ننھی منی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ علی مرتضیٰ پارک کے قریب ہی بنے اپنے بنگلے "مرتضی پیلیس" میں چلے آئے۔۔۔۔ وہ لان سے ہوتے ہوئے اپنے پیلیس کے اس حصے میں چلے آئے تھے، جہاں آنگن تھا اور اس آنگن میں بہت بڑا جھولا لگا ہوا تھا۔۔۔ جس جھولے میں ان کی تتلیاں بچپن سے جھولا جھولتی تھیں۔۔علی مرتضیٰ نے پیلیس بننے سے پہلے حویلی کے اس حصے کو اپنی بیٹیوں کی خواہش پہ ایسا ہی رہنے دیا تھا، اور آنگن سے آگے بہت بڑا لان بنوایا تھا۔۔۔ جس میں لگے ڈھیروں پودوں کی دیکھ بھال ان کی بیٹیاں کرتی تھی۔

"کیا ہوا علی بیٹا۔۔۔؟ یہاں اس طرح کیوں کھڑے ہو آپ۔۔۔؟ مالی نے بتایا کہ آپ پارک سے آکر سیدھے آنگن میں چلے آئے۔۔۔ابھی تو بارش کے ننھے قطرے زمین بوس ہو رہے ہیں، اس سے پہلے کے بارش زور پکڑ لے اندر چلو آپ۔۔۔" بوا علی مرتضیٰ سے فکرمندی سے بولی۔

"بوا! جب ہماری موہل، منال اور مثال اس گھر میں تھی تو کتنی رونق تھی اس گھر میں۔۔۔اب تو یہ گھر ان کے چلے جانے سے ویران سا ہو کر رہے گیا ہے۔ ایسے موسم میں تینوں کی نٹ کھٹ شرارتیں اپنے عروج پر ہوتی تھیں اور آپ کو یاد ہے بوا کہ جب بارش ہوتی تھی تو وہ تینوں آپ

کے ہاتھ کے پکوڑے اور گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے کے ساتھ بارش کو انجوائے کرتی تھی۔۔۔ میری پیار بھری ڈانٹ کے باوجود بارش میں گیلا ہوتی تھی اور اس کچے آنگن میں زمین پہ جمے پانی میں کاغذ کی ناؤ بنا کر چھوڑتی تھی، حالانکہ کافی بڑی ہو چکی تھی وہ تینوں مگر شرارتیں بالکل بچوں جیسی کرتی تھیں وہ"۔۔۔۔۔علی مرتضٰی کے لب ان کی شرارتیں یاد کر کے مسکرائے تھے البتہ آنکھوں میں نمی تھی، جو بوا کی بوڑھی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہی تھی۔۔۔

"علی بیٹا! مجھے سب کچھ یاد ہے، تینوں کی شرارتیں کیسے بھول سکتی ہوں میں۔۔۔ اُن کا سارا بچپن میری گود میں گزرا ہے۔۔۔۔ ویسے بیٹیاں کتنی ہی لاڈلی اور راج دُلاری رہے لیکن انھیں ایک دن تو اپنے اصلی گھر جانا ہوتا ہے۔۔۔ پرائی جو ہوتی ہیں بیٹیاں"۔۔۔۔۔ بوا نے ان سے کہا۔

"بوا! ہم جن ننھی گڑیوں کو انگلی پکڑ کر قدم سے قدم ملا کر چلنا سکھاتے ہیں، وہ اتنی جلدی بڑی کیوں ہو جاتی ہے۔۔۔۔ اور پھر اپنے باپ کے سینے میں دھڑکن بن کر دھڑکنے والی یہ بیٹیاں اپنے بابل کا انگنا چھوڑ جاتی ہیں۔۔۔جن بیٹیوں کو ہم اتنے لاڈ سے پالتے ہیں، پھر ہمیں ان سے جدا ہو جانا پڑتا ہے"۔۔۔۔علی مرتضٰی اُداسی سے بولے تھے۔

"علی بیٹا! یہ تو دنیا کی ریت ہے ہر بیٹی کو اپنے بابل کا آنگنا چھوڑنا پڑتا ہے۔۔۔۔ بیٹیاں تو بالکل آنگن کی تتلیوں کی طرح ہوتی ہیں، جو اپنے بابل کے آنگن میں محبتوں، شوخیوں، شرارتوں اور وفاؤں کے انمٹ رنگ چھوڑ جاتی ہیں، ایسے رنگ جو دور ہو کر بھی ماند نہیں پڑتے"۔۔۔ بوا انھیں سمجھاتے ہوئے بولی۔

"جی بوا! ایک باپ کے لیے سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے آنگن کی شوخ تتلیوں کو قدر دان لوگ ملے، سسرال میں اُنھیں سچے دل سے چاہا جائے۔۔۔۔اور اللہ کا شکر ہے کہ میری تینوں تتلیاں قدر دان لوگوں میں گئی ہیں"۔۔۔۔انھوں نے آسودگی سے کہا۔

"بالکل صحیح کہا آپ نے۔۔۔ اگر ان آنگن کی تتلیوں کو اپنے سسرال میں وہی مان اور محبت دی جائے جو انھیں ان کے مائیکے میں ان کے پیاروں سے ملتی ہے تو پھر سچ میں ان شوخ تتلیوں کے رنگ کبھی بھی پھیکے نہ پڑے"۔۔۔بوا نے مسکرا کر کہا۔

"بوا! آج سچ مچ مجھے میرے آنگن کی تتلیاں شدت سے یاد آ رہی ہیں"۔۔۔

"بیٹیاں تو سبھی کی پیاری ہوتی ہیں مگر مریم کے دنیا سے چلے جانے کے بعد آپ نے جس طرح تینوں بیٹیوں کی پرورش کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔۔۔آپ نے بچپن سے ماں اور باپ بن کر انھیں پالا، اسی لیے آپ ان تینوں کے لیے اتنے حساس ہو۔۔۔۔۔اچھا چلو میں آپ کو آج اپنے ہاتھ کے پکوڑے اور گرم، گرم چائے پلاتی ہوں"۔۔۔۔ بوا نے علی مرتضٰی سے کہا۔

"آپ کے ہاتھوں کا ذائقہ ہی الگ ہے بوا مگر اب اس عمر میں آپ سے کام کروانا اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔خانساماں بنا دے گا، آپ رہنے دو"۔۔۔۔۔علی مرتضٰی نے انکار کیا۔

"اب اتنی بھی بوڑھی نہیں ہوئی ہوں میں کہ کبھی کبھار اپنے بیٹے کے لیے کچھ بنا بھی نہ سکوں"۔۔۔۔۔ بوا نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے بوا، جیسے آپ کی مرضی۔۔۔۔۔علی مرتضٰی نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر بوا کے ساتھ چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

علی مرتضٰی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ بچپن سے اپنے والدین کی آنکھوں کا تارہ تھے۔۔۔محبتوں میں پروان چڑھ کر پڑھ لکھ کر اعلیٰ افسر بنے تو امّی اور بابا نے ان کی شادی کرنا چاہا۔۔۔علی مرتضٰی نے اپنے والدین سے بچپن سے اپنے دل میں بسنے والی، اپنی خالہ زاد کزن مریم سے شادی کا اظہار کیا۔۔۔۔۔ پھر انکی پہلی اور آخری محبّت مریم ،"مرتضٰی پیلیس" میں مریم مرتضٰی بن کر آ گئی۔۔۔۔مریم کو پا کر علی مرتضٰی کو اپنی زندگی مکمل لگنے لگی تھی۔۔شہزادوں سی آن بان والے علی مرتضٰی کو اپنی بیوی سے بے پناہ عشق تھا تو معصوم سی دیکھنے والی مریم بھی اپنے شوہر سے بے پناہ عشق کرتی تھی۔۔۔۔

محبتوں، وفاؤں اور خوشیوں کے سنگ ان کا سفر یونہی گزر رہا تھا۔۔۔۔اللہ نے ایک کے بعد انھیں دوسری بیٹی سے نواز دیا تھا۔۔۔ بڑی بیٹی کا نام انھوں نے موبل مرتضٰی رکھا تھا اور دوسری بیٹی کا نام منال مرتضٰی !....وہ اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں بہت خوش تھے، مگر جب مریم کے ہاں تیسری بیٹی کی پیدائش ہوئی تو وہ ڈیلیوری کے ٹائم جانبر نہ ہو سکی اور ننھی مثال کو علی مرتضٰی کی آغوش میں چھوڑ کر ابدی نیند سو چکی تھی۔۔۔۔علی مرتضٰی جان سے پیاری بیوی کی جدائی برداشت نہ کر پا رہے تھے۔۔۔۔۔۔لیکن ہوتا وہی ہے جو رب کو منظور ہوتا ہے اور ابھی علی مرتضٰی اپنی عزیز از جان شریکِ حیات کے غم سے نکل نہ پائے تھے کہ یک کے بعد دیگرے ان کے والدین بھی انھیں تنہا کر گئے، وہ بھی اپنے رب کے پاس چلے گئے تھے۔۔۔۔وہ پہ در پہ ملنے والے ان غموں سے جیسے ٹوٹ سے گئے تھے، مگر پھر بوا نے انھیں سنبھالا۔۔۔۔ بوا علی مرتضٰی کے بابا کی

چاچا زاد بہن تھی، بوا کے شوہر کے انتقال کے بعد بابا انھیں اپنے ساتھ حویلی لے آئے تھے، جب سے بوا یہیں تھی۔۔۔۔ پھر علی مرتضیٰ نے دوبارہ سے اپنی ننھی بیٹیوں کے لیے جینا سیکھ لیا تھا۔۔۔۔۔ علی مرتضیٰ نے مریم کے بدلے کا پیار بھی اپنی بیٹیوں کو دیا تھا۔۔۔۔ لوگ ان سے کہتے کہ دوسری شادی کر لو مگر انھوں نے اپنی ساری جوانی اپنی بیٹیوں کے لیے وقف کر دی تھی ۔۔۔۔ اُن کا کوئی بیٹا نہیں تھا مگر انھوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔۔۔ مومل کو ڈاکٹر، منال کو انجینئر اور مثال کو اپنی طرح افسر بنا کر دنیا میں اپنی بیٹیوں کو ایک مقام دلا کر ایک پہچان دلائی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی تینوں بیٹیوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کی تینوں بیٹیاں بچپن سے بہت شوخ وچنچل سی تھی، بالکل اپنی ماں مریم کی طرح۔۔۔۔ علی مرتضیٰ ان کی شرارتوں اور مسکراہٹوں سے ہر بار جی اٹھتے تھے، اپنی بیٹیوں کے لبوں پہ بکھری مسکان سے انھیں زندگی ہونے کا احساس ہوتا تھا۔۔

''وقت اچھا ہو یا برا، وقت تو وقت ہوتا ہے، ہمارے دامن میں یادوں کے خزانوں کو چھوڑ کر گزرتا چلا جاتا ہے ۔۔۔ علی مرتضیٰ کے آنگن کی وہ ننھی تتلیاں اب بڑی ہو چکی تھیں، اور پھر وہ بھی ایٹ ایٹ کرکے اپنے اصلی آشیانے کی طرف اڑ چکی تھیں مگر اس آنگن میں اپنی شرارتوں اوریادوں کے رنگ چھوڑ گئی تھیں۔۔۔ ایٹ باپ کے لیے کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو خود سے جدا کرنا، لیکن باپ تو ایسی ہستی ہوتی ہے جسے خدا نےبہت زیادہ قوت برداشت عطا کی ہوئی ہے ۔۔۔ باپ اپنے دل کے درد کو چھپا کر مسکراتے ہوئے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو وداع کرتا ہے۔''

وقت اچھا ہو یا برا، وقت تو وقت ہوتا ہے، ہمارے دامن میں یادوں کے خزانوں کو چھوڑ کر گزرتا چلا جاتا ہے۔۔۔ علی مرتضیٰ کے آنگن کی وہ ننھی تتلیاں اب بڑی ہو چکی تھیں، اور پھر وہ بھی ایک ایک کر کے اپنے اصلی آشیانے کی طرف اڑ چکی تھیں مگر اس آنگن میں اپنی شرارتوں اور یادوں کے رنگ چھوڑ گئی تھیں۔۔۔۔ ایک باپ کے لیے کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو خود سے جدا کرنا، لیکن باپ تو ایسی ہستی ہوتی ہے جسے خدا نے بہت زیادہ قوت برداشت عطا کی ہوئی ہے ۔۔۔ باپ اپنے دل کے درد کو چھپا کر مسکراتے ہوئے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو وداع کرتا ہے۔

آج کی شام بھی بہت دلفریب تھی۔ پرندے واپس اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے ۔۔۔ ہوائیں رقص کر رہی تھیں۔ علی مرتضیٰ لان میں چیئر پہ بیٹھے ہوئے تھے اور شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔۔۔۔ تبھی کسی نے پیچھے سے آ کر ان کی دونوں آنکھوں پہ اپنے ہاتھ رکھے تھے، علی مرتضیٰ نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر اُن ہاتھوں کو پکڑا جو چوڑیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

"میرے آنگن کی سب سے چھوٹی تتلی، میری پیاری سی گڑیا مثال آئی ہے"۔۔ وہ دل سے مسکرائے تھے۔

"السلام علیکم!۔۔۔ کیا یار بابا جانی آپ ہمیشہ رائٹ گیس کر لیتے ہو"۔۔۔ مثال مرتضیٰ ان کے دُرست اندازے پہ منہ بنا کر بولی تو علی مرتضیٰ نے مڑ کر اپنی پیاری بیٹی کو دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ والی چیئر پہ بٹھایا۔۔۔

"وعلیکم السلام!۔۔۔۔ بیٹا جی، ایک باپ اپنی بیٹیوں کو ہزاروں کی بھیڑ میں بھی پہچان لیتا ہے"۔۔۔ انھوں نے شفقت سے مسکرا کر کہا۔

" آئی نو بابا بٹ آپ کو ہمیشہ کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ کس ٹائم آپ کے پاس آپ کے آنگن کی کون سی تتلی آئی ہے۔۔۔۔ آپ ہمیشہ مجھے پہچان لیتے ہوں، کبھی مجھے آپ نے مومل آپی یا منال آپی نہیں سمجھا"۔۔۔ مثال نے حیرت سے ان سے کہا۔

بیٹا! آپ تینوں میرے آنگن کی تتلیاں ہو اور ہر تتلی کا اپنا الگ رنگ ہوتا ہے۔۔۔۔ اور میں آپ کو آپکی چوڑیاں پہننے کی عادت سے پہچان لیتا ہوں"۔۔۔ علی مرتضیٰ نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا جی! تو ایسی بات ہے، اب نیکسٹ ٹائم میں چوڑیاں پہن کر ہی نہیں آؤں گی۔۔۔۔ پھر پہچان کر بتانا آپ مجھے"۔۔۔ مثال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پھر بھی بیٹا جی ہم آپ کو پہچان لے گے"۔۔ علی مرتضیٰ بھی ہنسے تھے۔

"ویسے بیٹا! ہمارے آنگن کی تتلی کے آنگن کی تتلی کدھر ہے، ابھی تک اپنے نانو سے ملنے نہیں آئی"۔۔۔۔ انھوں نے منشا کا پوچھا۔

"وہ لیجیے آ گئی آپ کے آنگن کے آنگن کی تتلی"۔۔۔ مثال مرتضیٰ نے اپنے شریکِ سفر کے ساتھ سامنے سے آتی اپنی دو سالہ پیاری سی بیٹی منشا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"السلام علیکم بابا جانی!۔۔۔ کیسے ہو"۔۔۔؟ حازی حیدر نے ان کے بازو والی چیئر پہ بیٹھے ہوئے پوچھا۔۔ جبکہ منشا ان کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"وعلیکم السلام!۔۔۔ شکر ہے اللہ کا اور جب میں اپنے آنگن کی تتلیوں میں سے کسی ایک تتلی کو بھی دیکھ لوں تو زندگی مسکرانے لگتی ہے"۔۔۔ علی مرتضٰی خوشی سے بولے تھے۔

"باباجانی! اب زندگی ایسے ہی مسکرائے گی"۔۔۔ حازی نے مسکرا کر کہا۔

"جی باباجانی!۔۔۔ کیوں کے اب آپ کے آنگن کی سب سے چھوٹی تتلی اب آپ کے سامنے، آپ کے ساتھ ہی "مرتضٰی پیلیس" میں رہے گی اپنے تمام رنگوں سمیت۔"۔۔۔ مثال نے خوشی سے جگمگاتی اپنی روشن آنکھوں سمیت کہا۔

"میں سمجھا نہیں مثال بیٹا"!۔۔۔۔ علی مرتضٰی حیران ہوئے تھے۔

"بابا! میرے مما، پاپا بھائی جان کے پاس سعودی شفٹ ہو رہے ہیں۔۔۔ اسی لیے ہم لوگ آپ کے ساتھ "مرتضٰی پیلیس" میں شفٹ ہوجائے گے"۔۔۔ حازی نے کہا۔

سچ بیٹا، لیکن آپ کے پیرنٹس کو کوئی اعتراض تو نہیں"۔ علی مرتضٰی نے کہا۔

"نہیں باباجانی!۔۔۔ ماما، پاپا نے خود ہی ہم سے کہا ہے"۔۔۔ حازی نے انھیں تسلی دی۔

"اگر آپ سچ مچ "مرتضٰی پیلیس" میں شفٹ ہوجاؤ گے تو پھر سمجھو میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہے گی"۔۔۔ انھوں نے خوشی سے لبریز لہجے میں کہا۔

"جی بابا، انشاء اللہ ہم لوگ جلد یہاں شفٹ ہو جائیں گے۔۔۔ اور آپ نے ہماری خوشیوں کے لیے اتنا کچھ کیا ہے اور اب آپ کی بیٹی آپ کی خوشی کے لیے آپ کے پاس رہے گی تا کہ آپ کو تنہائی کا احساس نہ ہو"۔۔۔۔ مثال نے محبت سے علی مرتضٰی کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

"تھینک یو سو مچ بیٹا"!۔۔۔۔ علی مرتضٰی بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

" نو تھینکس بابا، جب ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے اور آپ کو اب ہماری ضرورت ہے تو ہم بیٹیوں کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے کہ آپ کی خوشیوں کا خیال رکھا جائے۔۔ اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے مجھے ایک بہترین اور محبّت کرنے والے ساتھی کا ساتھ دیا ہے جو میرے ہر قدم پہ میرے ساتھ ہے"۔۔۔ مثال نے محبت سے اپنے ہمسفر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھینکس تو آپ کا بھی بنتا ہے حازی بیٹا کہ آپ مثال کے ساتھ میرے پاس آ کر رہو گے"۔۔۔ علی مرتضٰی نے تشکّر سے حازی کو دیکھا۔

بابا!۔۔۔ اب آپ تھینکس بول کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔۔۔ آپ تو بیٹا کہتے ہے نا مجھے اور پھر باپ اپنے بیٹے کو تھینکس کہتے ہوئے اچھے نہیں لگتے"۔۔۔۔۔ حازی نے مسکرا کر کہا تو علی مرتضٰی اپنی جگہ سے اٹھے اور حازی کو اٹھا کر خوشی سے اپنے گلے سے لگالیا۔

آج دوپہر سے خوب بارش برسی تھی۔ اب شام کو بارش رکی تھی۔۔۔ بارش میں نہا کر پیڑ، پودے اور پھول نکھر چکے تھے۔ ٹھنڈی ہواؤں نے ماحول میں بسیرا کیا ہوا تھا۔ "مرتضٰی پیلیس" میں خوشیوں کی شام اُتری ہوئی تھی، کیونکہ "علی مرتضٰی کے آنگن کی تتلیاں اپنے آنگن میں اپنی خوشیوں کے رنگ بکھیر رہی تھیں۔۔۔۔ مثال کو ایک ماہ ہو چکا تھا یہاں شفٹ ہوئے جبکہ موبل اور منال اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے یہاں آئی تھی۔۔۔۔ اور ان کے آ جانے سے خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ "مرتضٰی پیلیس" کے در و دیوار اُنکے قہقہوں سے گونج رہے تھے۔۔۔ علی مرتضٰی اپنے آنگن کی ان تتلیوں کے ساتھ زندگی کے ان حسین سے پلوں کو دل سے خوشی کے ساتھ جی رہے تھے۔۔۔

شام کی چائے پہ بوا نے خوب اہتمام کیا تھا۔۔۔ موبل، منال اور مثال چائے پینے کے بعد اس آنگن میں چلی آئی تھی جس آنگن سے ان کی زندگی کے یادگار لمحے جڑے ہوئے تھے۔۔۔ آنگن کی تینوں تتلیاں اس جھولے پہ آ کر بیٹھ گئی اور اپنے گود میں اپنے اپنے آنگن کی تتلیوں کو بٹھایا جبکہ علی مرتضٰی خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ انھیں جھولا دے رہے تھے۔۔۔ موبل اور منال کے بیٹے ان کی ویڈیو اور یادگار پکس اور ساتھ میں سلفیاں لے رہے تھے۔۔ جبکہ دور چیئر پہ بیٹھی بوا نے آنگن کی تتلیوں کو اس طرح ہنستے، مسکراتے اور شوخیاں بکھیرتے دیکھ کر دل سے ان تیلیوں کے شوخ رنگ آباد رہنے کی دعا دی تھی۔۔۔ اللہ آنگن کی ہر تتلی کے شوخیوں، محبتوں، خوشیوں اور وفاؤں کے رنگوں کو کبھی بھی پھیکا نہ پڑنے دے۔۔

□□□

Rumana Iffat Rahi
D/o: Shaikh Bilal
Hirapura Near Masjid Darussalam
Dist: Amravati-444806 (M.S)
Mob:9503161257

ڈاکٹر بشریٰ اشرف

خواتین اور نفسیاتی مسائل

تعارف:۔ خواتین خانہ کو ہمارے مہذب معاشرے میں ابتدا سے ہی جو ذمہ داریاں تفویض ہوئی ہیں وہ انتہائی اہم اور انسانی نسل کی بقاء و دوام کے لیے ضروری بھی ہیں عام بات ہے کہ ایک زمہ دار خاتونِ خانہ، نئی پود کے لیے ابتدائی دانش گاہ ہوتی ہے اور یہ دانش گاہ جتنی مضبوط و مستحکم ،فعال و متحرک اور ذہین وقابل ہوگی، اتنی ہی اس کے زیرِ نگرانی، پرورش پانے والی نئی نسل بھی ذہین و قابل، تندرست وتوانا اور فعال و متحرک ہوگی اور ملک وقوم کے لیے قابل عزت وافتخار و بھی۔

جہاں یہ بات باعث اطمنان وخوشی ہے کہ حال ہی میں، دنیا بھر میں، یوم خواتین منایا گیا اور منایا جاتا ہے کہ ہر ملک میں ،اس ضمن میں مختلف پروگرام ،تقاریب ،سیمنار وغیرہ بھی ہوتے ہیں، جن میں دنیا بھر کی خواتین کے معاملات ومشکلات اور زندگی کے ان مختلف شعبہ جات میں ان کی حصولیابیوں کو موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے اور ان پر کھل کر بات کی جاتی ہے جو ان کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں، البتہ یہ بات دنیا کے باشعور لوگوں، خاص کر ہندوستان میں رہنے والوں کے لیے کچھ کم باعثِ انتشار و تشویش نہیں، کہ ہندوستان میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں خودکشی کا رجحان تشویشناک حد تک بڑھ رہا ہے کہ پوری دنیا میں جتنی تعداد یا تناسب سے خواتین کے خودکشی کے معاملات درج ہوتے ہیں، ان میں 36 فیصد خواتین کا تعلق ہندوستان سے ہوتا ہے۔ ظاہرسی بات ہے یہ تعداد یا تناسب بہت زیادہ ہے اور قابل، فکر وتشویش بھی۔

سال 2021 کے اعداد و شمار بتارہے ہیں کہ اس سال تقریباً 45 ہزار خواتین نے خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کیا یہ سنجیدہ اور فوری توجہ کا متقاضی معاملہ اس تشویشناک صورت حال کی غمازی کرتا ہے کہ ہم بحثییت مجموعی خواتین کی دماغی یا ذہنی صحت سے متعلق ،موجودہ مسائل کی سنگینی کی طرف بھر پور توجہ دینے سے قاصر ہیں۔ جس کے وہ مستحق ہیں۔

ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں تقریباً 150 ملین افراد کو نفسیاتی صحت سے متعلق طبی مشوروں اور نگہداشت ، کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے جو سرکاری ،نیم سرکاری یا پرائیویٹ ادارے یا تنظیمیں اس طرح کے کام سے وابستہ ہیں ان کی تعداد ایک تو، بہت کم ہے اور دوسرا، وہ بہت حد تک اس معاملے پر اپنی توجہ فوری طور پر ذمہ داری ،قابلیت اور خود اعتمادی کے ساتھ مبذول نہیں کر پارہی ہیں اور کسی حد تک اپنے فرائض سے بےخبر وغافل بھی ہیں جس کے بہت سارے اسباب ووجوہات بھی ہیں۔

یہ بات سائنسی تحقیق سے ثابت ہوچکی ہے کہ دماغی یا نفسیاتی اور جسمانی صحت کے مابین ایک گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ انسان کے ظاہری افعال و اعمال پر اس کے باطنی جذبات و احساست اور ہیجانات کا براہ

راست تعلق اور رشتہ ہے۔انسان کی فکر وسوچ سے انسانی جسم پر تاثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ ہر طرح کے لوگوں کو اپنے معاشرے میں بودوباش کرتے وقت الگ الگ اور منفرد و مخصوص معاملات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جن سے کسی کو بھی مفر حاصل نہیں۔ یہ اجتماعی بھی ہو سکتے ہیں اور انفرادی بھی۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر اسطرح کے مسائل کی طرف فوری توجہ نہیں دی جاتی ہے اور تساہل اور لیت ولعل سے کام لیا جاتا ہے جس سے یہ روز بروز مشکل سے مشکل تر بنتے جارہے ہیں۔ یہ بات بھی ثابت ہوچکی ہے کہ اگر ہماری دماغی صحت اور نفسیاتی حالت اچھی ہے تو نہ صرف ہماری جسمانی صحت وحالت بھی اچھی ہوسکتی ہے بلکہ ہمارے عرصۂ حیات میں بھی اضافہ ہونے کا امکان ہے۔

آج کی اس تیز رفتار اور بھاگتی دوڑتی زندگی میں، ہم اپنے معاملات ومسائل کی طرف فوری دھیان نہیں دے پارہے ہیں، اپنی ذہنی پریشانیوں ،نفسیاتی مسائل،تذبذب و افراتفری،انتشار و اضطراب پر بروقت توجہ نہ دینے سے یا تساہل ولاپروائی برتنے سے ہماری دماغی اور نفسیاتی صحت متاثر ہوکر، ہماری جسمانی صحت پر بھی اس کا اثر پڑسکتا ہے جس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ ہم مختلف نفسیاتی امراض وعوارض میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو نہ صرف ہمارے سکون واطمینان کو غارت کردیتے ہیں بلکہ اس سے ہماری زندگی سے متعلق روزمرہ کے معاملات ومعمولات بھی خراب ہونے لگتے ہیں کہ ہم طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور دماغی الجھنوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، ظاہری سی بات ہے معاشرے سے جڑا ہر فرد سوسائٹی کا عضو ہوتا ہے، رفتہ رفتہ اس سے پورے معاشرے کی صحت داؤ پر لگ جاتی ہے۔

اس مسئلے کی سنجیدگی اور حساسیت سے بے نیاز ہوکر، اس کے علاج و معالجے میں سہل نگاری اور عدم توجہی سے کام لے کر، ماہرینِ طب یا نفسیاتی معالجین کی طرف رجوع کرنے ،یا پھر اس کے اظہار کرنے سے ،کترانے سے، کہ پتہ نہیں لوگ کیا کہیں گے؟ خاص طور پر اس وقت کچھ زیادہ ہی ،جب اس میں خواتین مبتلا ہوں، یہ معاملات لمحہ بہ لمحہ خرابی کی طرف ہی بڑھتے رہتے ہیں، درست اور ٹھیک ہونے میں نہیں آتے۔

دماغی اور نفسیاتی صحت سے متعلق ادارہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ اینڈ نیوروسائنسز (NIMHANS) کے ایک تازہ ترین سروے اور تحقیق کے مطابق ،ہندوستان میں تقریباً 15 کروڑ افراد ایسے ہیں جن کی ذہنی یا نفسیاتی صحت ٹھیک نہیں ہے اور انھیں اس ضمن میں فوری طور پر علاج و معالجے کی ضرورت ہے اور توجہ درکار ہے تاکہ ان کا مناسب اور بروقت علاج ممکن ہو سکے لیکن یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ ان میں صرف تین کروڑ سے بھی کم مریض ایسے ہیں جو اپنی نفسیاتی بیماریوں اور عوارض کا موثر علاج کرانے کے سلسلے میں سنجیدہ یا متفکر ہیں باقی مریض بالکل خاموش بیٹھے ہیں اور اس سلسلے میں کچھ کرنے میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں، اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی بتائی جارہی ہے کہ اکثر لوگ معاشرے میں بدنامی کی وجہ سے علاج کی طرف نہیں آتے اور اپنی بیماری کو چھپانے اور لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کے موڈ میں ہوتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔

برطانیہ کے ایک مشہور طبی رسالے نے ہندوستان میں 2017 کے ایک سروے میں ،ذہنی اور نفسیاتی صحت سے متعلق ،مریضوں کی تعداد 1990 سے 2017 تک دوگنی ہونے کی بات کی ہے۔ حالیہ ایام میں اس تعداد وتناسب میں اور زیادہ اضافہ کووڈ وباء کی وجہ سے ہونے کی بات کی جارہی ہے۔ لیکن اس بات پر ہر ایک کا زور ہے کہ اس بیماری میں اضافے کی بنیادی وجہ اس کو ایک عرصہ تک پوشیدہ رکھنے کا عمل ہے اس کی ایک وجہ نفسیاتی عوارض سے متعلق مناسب تعلیم وتربیت کا فقدان بھی بتایا جارہا ہے کہ ملکی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ، نفسیاعی عوارض سے متعلق تعلیم و تربیت اور آگاہی سے محروم ہے اور انسانی نفسیات کے بنیادی اصول و قواعد اور ضوابط سے بھی لوگ ناواقف بتائے جارہے ہیں۔ غالباً غربت و

افلاس اور کم خواندگی کی وجہ سے بھی۔

تحقیقی سروے سے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ ملکی آبادی میں ہر چار افراد میں سے ایک فرد، زندگی کے کسی بھی مرحلے پر، ذہنی مسائل سے دوچار ہو سکتا ہے اور نفسیاتی امراض میں مبتلا مریضوں میں 15 فیصد کا تعلق عمر کے 18 سال سے اوپر والے گروپ کا ہے۔

اسباب وعوامل:۔ معاشرے سے وابستہ ،مرد اور خواتین، یہاں تک کہ بچے بھی، کسی نہ کسی طرح ،اس طرح کے مسائل سے دوچار ہیں، لگ بھگ ہر فرد، خواہ وہ عمر کے کسی بھی مرحلے میں ہے، مختلف النوع مشکلات کو جھیل رہا ہے، آزادی اور خودداری سے کام کرنے کے ماحول کا فقدان، طویل وقفے تک کام کرتے رہنا، سخت نوعیت کے کام سے ذہنی اور جسمانی تھکان، بیکاری، قرضوں کا بوجھ، آمدنی کی کمی اور اخراجات کی زیادتی، مالی بحران، ملازمت کے چلے جانے کا احساس اور عدم تحفظ، جنس، ذات، فرقہ اور رنگ ونسل کے اختلافات، تعلیمی پسماندگی، ملکی، مسلکی اور جغرافیائی تعصب اور نابرابری، مادہ پرستانہ فکر وسوچ، حرص و ہوس، ذاتی فائدے کے لیے دوسروں کا استحصال، ازدواجی زندگی میں ناچاکی پیدا ہونا وغیرہ لاتعداد مسائل اس کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

ذہنی اور نفسیاتی تندرستی کی تعریف:۔ عالمی ادارۂ صحت نے ذہنی اور نفسیاتی صحت کی تعریف متعین کی ہیں یہ ایک شخص کی اس حالت کا نام ہے، جس میں وہ، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اپنی استعداد وادراک سے واقف ہو، زندگی کے عمومی تناؤ کو برداشت کرنے کا، اپنے کام کو بخوبی انجام دینے کا، اور اپنے ملک وقوم کے لیے کام انجام دینے کا ارادہ اور جذبہ رکھتا ہو وغیرہ۔ ہندوستان میں 2016 میں نیشنل مینٹل ہیلتھ سروے کے دوران متعدد تلخ حقائق سامنے آگئے، ان کے مطابق 10 فیصد لوگ عام ذہنی انتشار، اضطراب وفکر مندی اور پریشانیوں کے شکار ہیں، جن میں بطورِ خاص بے روزگاری یا محدود روزگار، کم آمدنی، آمدنی اور خرچے میں نابرابری، محدود وسائل، خانگی مسائل واختلافات کا ذکر کیا گیا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر کم تعلیم یافتہ لوگ نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور پھر موثر علاج نہ ملنے پر، وہ بعد میں کوئی انتہائی اقدام لے لیتے ہیں ،جیسے خودکشی وغیرہ ،جن میں خواتین، کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہے ،خاص کر دیہی خواتین کا، جو عیش وآرام کے تصور تک سے بھی ناواقف ولاتعلق ہوتی ہیں اور جن کی زندگی کافی کٹھن اور مشکل ہوتی ہے، اس پر طرہ یہ کہ دماغی اور نفسیاتی علاج اور ایسے مریضوں کی نگہداشت کی صورتِ حال ملک میں کافی سنگین اور خراب ہے وغیرہ۔

ملک کے سالانہ قومی بجٹ میں، اس مد میں صرف اعشاریہ صفر آٹھ فیصد حصہ دماغی اور نفسیاتی صحت پر صرف ہوتا ہے جو آبادی کے تناسب اور ان امراض میں مبتلا مریضوں کے لیے بہت کم ہے۔ بہت کم رضا کار تنظیمیں اور NGOS اس میدان میں سرگرم اور فعال ہیں ملک کی کل آبادی کا 70 سے 80 فیصد تک کا حصہ بنیادی نفسیاتی علاج ومعالجے کی سہولیات سے محروم ہے شہروں اور قصبوں دونوں میں مینٹل ہیلتھ کیئر سروس کی صورتِ حال تسلی بخش نہیں ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ سہولت میسر ہے دیہی علاقوں میں یہ صورتِ حال اور بھی ابتر ہے۔ تربیت یافتہ طبی عملے کی عدم دستیابی، رقومات کی کمی ،غیر معیاری سازوسامان اور ادویات کا استعمال، علاج ومعالجے پر آنے والے اخراجات کا عام لوگوں کی قوتِ خرید سے زیادہ ہونا، علاج کی سہولیات کا فاصلے پر میسر ہونا وغیرہ مشکلات درپیش رہنا کچھ بنیادی عوامل ہیں جن پر فوری توجہ بہت ضروری ہے۔

بچاؤ تدابیر اور علاج ومعالجہ:۔ کیرالہ اسٹیٹ میں مجموعی خواندگی کا تناسب ملک کی دیگر ریاستوں سے زیادہ ہے اور کیرالہ کے علاوہ ملک کی دیگر ریاستوں کے ایک لاکھ افراد پر مشتمل آبادی پر ایک ماہر نفسیات موجود و مقرر ہے جبکہ صرف کیرالہ میں یہ تناسب دیگر ریاستوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ چونکہ ہندوستان میں خواتین میں، خودکشی میں، شرح اموات یا شرح فیصد عالمی شرح فیصد سے دوگنی سے بھی زیادہ ہے یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہاں خواتین میں بھی ،نوجوان خواتین ہی زیادہ خودکشی کی مرتکب ہوتی ہیں۔ اس بات کے باوجود بھی کہ دماغی صحت کے قانون 2017 (مینٹل ہیلتھ کیئر ایکٹ) کے تحت اقدام خودکشی پر قانون میں ترمیم بھی کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود بھی نفسیاتی مریضوں کے علاج اور ان کے حقوق کے تحفظ کے ضمن میں وسیع پیمانے پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ دیگر ضروری اقدامات کے ساتھ ساتھ لوگوں کی اچھی تعلیم وتربیت ہی اس کا اصل علاج ہو سکتا ہے۔

□□□

Dr.Bushra Ashraf
B.H.M.S
(Barkat-ull-ah University(BHOPAL)
Sudrabal, Hazratbal
Srinagar-190 006 (Kashmir)
Cell:-7780836240

مراسلہ

''خواتین دنیا'' برائے اپریل2023 وصول ہوا۔ سرورق پر نظر چکرا گئی کہ کسی کی زلفوں میں کسی کی شکل لٹکا دی گئی، کئی چہرے در چہرے۔ بہرحال تمام تر ساں تجریدی آرٹ کا عمدہ نمونہ ہو۔ اب ایسے نظاروں میں ذہن الجھا رہا تو منظوم گیت بھی الجھ جائیں گے یعنی کسی شاعر نے کہا ہے ؎

.........کوئی دیوانگی

پیڑ سے توڑ دے مچھلیاں بلیوں کو تو گانا سکھا
چاند کو کر دے چوکور تو اور سورج تکونا بنا
بنا پہیے کی گاڑی میں چل بھول جا اپنے گھر کا پتہ
لے کے ہاتھی کو مٹھی میں تو دیکھ لے کیڑے اونٹ کا
میں تو پاگل ہوں.........

یہ تو سرورق کی روداد ہوئی اور اندرونی صفحات کوئی دس اصناف سخن سے مزین ہیں۔ مشعل (ص4) مشعل راہ ثابت ہوئی ہے لیکن یہ طے ہے کہ فطرت نے مرد و زن کے جو حدود متعین کیے ہیں ان پر کاربند رہا جائے تو کسی کو کوئی شکوہ نہ ہوگا۔ شخصیت (ص5 تا8) میں فاطمہ تاج کی ادبی خدمات کا تذکرہ ہے اس میں اہم بات یہ ہے کہ کوئی درجن بھر ادبی شخصیات نے ان کی تعریف کی ہے۔ ایک ستائشی مقالہ جس میں مصنف کا کوئی رول نہیں۔ ''شاعرات کے منتخب اشعار'' (ص8) میں سبھی اشعار قابل تعریف ہیں لیکن ربیعہ فخری کے اشعار قابل داد ہیں۔ جہانِ نسواں (ص9 تا ص39) میں آٹھ عمدہ مقالے درج ہیں۔ ان کا پہلا مقالہ محترمہ قمر جمالی کا لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے موضوع پر ازاول تا آخر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کا انداز بیان اور لفظوں کا رکھ رکھاؤ نہایت قابل تعریف ہے۔ باقی مضامین کو بھی قابل تعریف کہنے دیجیے۔

''اعتراف ہنر'' (ص40 تا 43) میں افسانچہ نگاری پر فرزانہ پروین صاحبہ کا مضمون شامل ہے۔ انھوں نے بتایا کہ آج کل کی مصروف زندگی کی بنا پر زیادہ تر لوگ افسانچہ میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ بات بھی معقول ہے اور مضمون بھی۔

''حسن سخن'' (ص44، 45) میں محترمہ ڈاکٹر جوہی بیگم شاما کی دونوں غزلیں (ص44) بہت خوب ہیں۔ ڈاکٹر سمی اقبال نے اپنی آزاد نظم ''بیٹی'' (ص45) میں بیٹی کے ظاہری و باطنی تمام تر خصائص و نقائص کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ ''افسانہ'' (ص46 تا54) میں تین افسانے دیئے گئے ہیں۔ پہلا ''جل اٹھے چراغ راہوں میں'' تھوڑا طویل پر اچھا افسانہ ہے۔ یعنی لوگ تو بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں۔ دوسرا افسانہ ''چھٹیاں'' میں بتایا گیا ہے کہ چھٹیوں میں پردیس سے آنے والے کاروباری بچے کس طرح ماں کی چھٹی کر دیتے ہیں۔ ''سیل'' بھی خرید و فروخت سے متعلق واجبی سا افسانہ ہے۔ ''صحت'' (ص55 تا57) کے تحت گردے اور مثانے کی پتھری سے متعلق علاج و معالجہ اور نسخے تجویز کیے گئے ہیں۔ ''مراسلہ'' (ص56 تا 58) میں قارئین کے تین خطوط ہیں جن میں سبھی باتیں درج ہیں۔ چاہیں تو اُن پر غور کیجیے یا ملتوی کر دیجیے۔ ''خواتین خبرنامہ'' میں (ص59 تا60) خواتین سے متعلق دلچسپ خبریں درج ہیں۔ پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ آپ نے جس عمدگی سے ان مضامین کو شامل کیا ہے اس سے لگتا ہے کہ گویا آپ کی بادِ بہاری نے خزاں کو ناپید کر دیا۔ بقول فانی

چمکا دیا ہے رنگِ چمن لالہ زار نے
شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے

مصطفی ندیم خاں غوری، زرّین ولا، بی-اا، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا) 431001

❑❑❑

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دور سے معلومات کی حصول

مصنف: محمد احرار عالم، مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 130

قیمت: 90 روپے

ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج

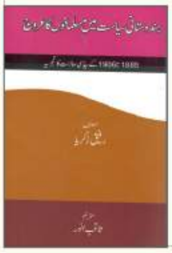

مصنف: رفیق زکریا، مترجم: ثاقب انور

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 533

قیمت: 245 روپے

ممتاز محل

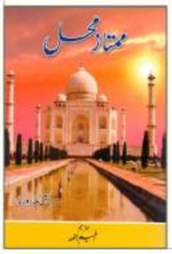

مترجم: فہیم احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 442

قیمت: 210 روپے

عوام الناس کے صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

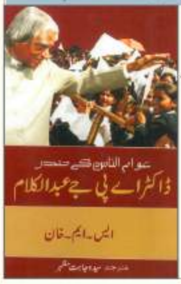

مصنف: ایس ایم خان، مترجم: سید وجاہت مظہر

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 166

قیمت: 95 روپے

آب و ہوا کا سائنسی مطالعہ

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر

مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 435، قیمت: 220 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

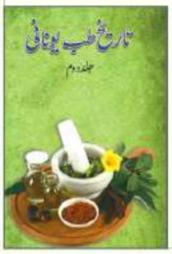

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

تشریح البدن (جلد سوم)

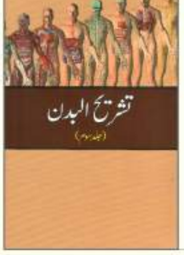

ادارہ

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 455

قیمت: 210 روپے

تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)

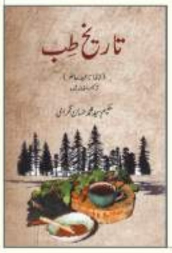

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی

ساتویں اشاعت: 2022

صفحات: 606

قیمت: 280 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जून- २०२३ वर्ष:७, अंक: ६

Mahnama Khawateen Duniya Monthly June 2023, Vol. 7, Issue: 6

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026

DL (S)-17/3555/2021-23

ISSN 2581-4826

Date of Publication: 13- 06-2023

Date of Dispatch : 14 and 15 of every month

Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025